ماہنامہ
طلوعِ اسلام
قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر
لاہور

اگست 2012ء

قرآن کی روشنی میں اللہ اور انسان کا تعلق

1- اللہ کی ذات کے متعلق ہم ازخود کچھ نہیں جان سکتے انسان زمان و مکان میں مقید محدود علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ لامحدود کے علم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنی جن صفات کو قرآن میں بیان کیا ہے' ان سے ہم اس کے متعلق اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

2- خدا تمام کائنات کا خالق اور اس پر مطلق اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی صفاتِ مطلق کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کے پیمانے ان مطلق صفات کے تحت بناتا ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا ذکر' الاسماء الحسنٰی کہہ کر مزید وضاحت کی ہے۔ حسن صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ الاسماء الحسنٰی خدا کی ذات کے مختلف پہلو (Facets) ہیں خدا کی ذات موجود فی الخارج ہے اور چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص و صفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔

3- قرآن کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے صفات و اقدارِ خداوندی کے علم کا حصول اسی قرآنِ کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے' جسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی ہدایت جاننے کے لئے کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے اقدار و احکام کی اطاعت کی جائے اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر' اس کی دی ہوئی راہنمائی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستہ کو اختیار کریں۔

4- خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے' انسانی ذات کی بنیادی صفات خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں' اس فرق کے ساتھ کہ:

(الف) انسانی ذات کی یہ صفات محدود' سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔

(ب) انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی مضمر یا خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ان کو مشہود یا بارآور (Actualise) کرنا ہوتا ہے۔

(ج) صفات خداوندی کے جذبات سے بلند' منزا اور مبرا ہونے کے بالمقابل' انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے۔شہودِ صفات سے پہلے جذبات پر پورا پورا کنٹرول کرنا لازمی امر ہوتا ہے۔

5- انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو معیار بناتے ہوئے ہر ممکن استعداد سے انہیں اپنے اندر منعکس کیا جائے۔جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہوا اس کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگا جاتا ہے۔اس طرح وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے اور خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں بہر حال خدا رفیق اعلیٰ ہوتا ہے۔

6- صفاتِ خداوندی کی انسانی ذات میں نمود سے جوں جوں اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے' یہ اس کے ایمان اور سیرت میں مزید پختگی کا باعث بنتی ہے۔اس طرح وہ ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے حیات بعد الممات کا امیدوار بننے کے قابل ہو جاتا ہے تاکہ اس مقام کے حصول کے بعد وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔

7- صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر' باہم گر متضاد بھی ہیں۔مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ذات (کیریکٹر) کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور حسنیٰ کے تحت اس قدر ظہور ہو جس قدر اس موقع پر اس کی ضرورت ہو۔اگر غفور و رحیم کی صفات کے اطلاق ہونے کے مواقع پر قہاریت و جباریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں اصلاح کی بجائے فساد برپا ہو سکتا ہے۔

8- انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ایسی شے نہیں جس کے متعلق دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے۔ان صفات کا اظہار' انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے' جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آ جاتا ہے۔اسی کو انسان کا کیریکٹر کہتے ہیں۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

فہرست

لمعات: (یاداس کی آئی غم تازہ ہوا)	ادارہ	3
زمانہ آیا ہے بے حجابی کا.....	ادارہ	13
اسلامی مملکت میں قانون کا سرچشمہ صرف قرآن ہوتا ہے	خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی	25
روزوں کا مقصود و منتہیٰ	غلام احمد پرویزؒ	34
قرآن فہمی کے چند نکات	ملک حنیف وجدانی	42
عید مبارک	ادارہ	46
عید کا چاند	ثمینہ بلال	47
آزمائش شرط ہے!	عطاء الحق قاسمی	48
لندن کا بُت کدہ	منصور آفاق	52
خدائی فیصلہ	غلام احمد پرویزؒ	54

طلوع اسلام کا لٹریچر یہاں سے دستیاب ہے

نیچے درج کئے گئے کتب خانوں سے طلوع اسلام ٹرسٹ کی تمام کتب، دروس القرآن کی تمام جلدیں، اسلامی کتابیں اور لائبریری کے لئے تمام موضوعات پر ہمہ قسم کتب رعایتی نرخوں پر خریدنے کے لئے تشریف لائیں۔

1- کلاسک بک سیلرز، 42، دی مال (ریگل چوک)، لاہور۔	فون: 042-37312977، موبائل: 0300-4442226
2- سانجھ بک سیلرز، بک اسٹریٹ 46/2، مزنگ روڈ، لاہور۔	موبائل: 0333-4051741
3- مسٹر بکس، بک سیلرز، سپر مارکیٹ، اسلام آباد۔	فون: 051-2824805-2278843
4- البلال بک ڈپو، اردو بازار، کراچی۔ موبائل: 0344-2502141	5- شہباز بک ایجنسی، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32632664
6- مذہبی کتب خانہ، اردو بازار، کراچی۔ موبائل: 0331-2716587	7- شاہ زیب انٹر پرائزز، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32214259
8- علمی کتاب گھر، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32628939	9- مکتبہ دارالسلام، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32212269
10- مکتبۂ دارالقرآن، اردو بازار، کراچی۔	11- محمد علی، کارخانہ اسلامی کتب، اردو بازار، کراچی۔ فون: 021-32631056
12- ایوانِ کتب، اردو بازار، لاہور، فون: 0321-8836932	

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

یاد اس کی آئی غم تازہ ہوا

(14 اگست کی یاد میں!)

گردشِ لیل ونہار کے حسابی اور میکانکی نظام کی رُو سے، چند دنوں کے بعد، ایک بار پھر 14 اگست سامنے آنے والی ہے۔ تغیراتِ احوال کی ستم ظریفی بھی عجیب حیرت فروش ہوتی ہے۔ واقعہ وہی ہوتا ہے لیکن اس کے تاثرات یکسر بدل جاتے ہیں۔ کبھی اس تقریب کی آمد آمد سے کیفیت یہ ہو جایا کرتی تھی کہ: ؎

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اس بزم میں جانے کا نام

اور اب یہ عالم ہے کہ: ؎

یاد اس کی آئی، غم تازہ ہوا
غم کسے کہتے ہیں؟ اندازہ ہوا

قوموں کی تاریخ میں اس قسم کے تغیرات کہیں صدیوں میں جا کر نمودار ہوتے ہیں، لیکن یہ شاید اس ''اٹامک ایج'' کا اثر ہے کہ ابھی کل کی بات ہے کہ ہم عید آزادی کا جشن منایا کرتے تھے، اور آج یہ حالت ہے کہ اس تقریب پر ہر قلبِ حساس پکار اٹھتا ہے کہ: ؎

یہ لُٹی لُٹی سی بہار کیوں ہے، کہاں وہ جانِ بہار ہے؟
یہ چمن سے کون چلا گیا، کہ کلی کلی کو فشار ہے!

لیکن اس سوگواریٔ بہار کے باوجود، طلوعِ اسلام اپنی اس ذمہ داری کو فراموش نہیں کر سکتا کہ ان بھولے ہوئے افسانوں کی

یاد تازہ کراتا رہے۔

☆☆☆

تحریکِ پاکستان کے دوران کانگریس کے ہمنوا' بار بار قائداعظمؒ سے کہتے تھے کہ جب ہمارا مقصد بھی حصول آزادی ہے اور آپ کا مقصد بھی وہی' تو آپ کو ایک الگ تنظیم قائم کرنے اور جداگانہ تحریک چلانے کی ضرورت کیا ہے؟ آپ ہمارے ساتھ شامل ہو جائیے۔ ہم دونوں مل کر' انگریز کو یہاں سے نکال کر آزادی حاصل کر لیں گے اور نظامِ جمہوریت کی رُو سے عوام کی حکومت قائم کریں گے جس میں تمام باشندگانِ ملک کو یکساں آزادی حاصل ہوگی۔ اس کے جواب میں (پہلے علامہ اقبالؒ اور ان کے بعد) قائداعظمؒ ان سے کہتے تھے کہ لفظی طور پر تو آپ ٹھیک کہتے ہیں' لیکن جہاں تک لفظ آزادی کے مفہوم کا تعلق ہے' وہ آپ کے اور ہمارے نزدیک ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہے۔ آپ کے نزدیک آزادی سے مفہوم یہ ہے کہ انگریز یہاں سے چلا جائے اور اہلِ ہند اپنی حکومت آپ قائم کر لیں لیکن ہمارے نزدیک آزادی کا مفہوم و مقصود اس سے مختلف ہے اور وہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد مملکت قائم نہ ہو جائے۔ (بالفاظ دیگر) وہ ان سے کہتے تھے کہ تمہارے نزدیک ''آزاد مملکت'' کا قیام مقصود بالذات ہے اور ہمارے نزدیک' آزاد مملکت اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کا منتہیٰ ہے اور یہ منتہیٰ تھا اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی۔ یہی وہ نقطہ تھا جو درحقیقت مابہ النزاع تھا۔ ساری جنگ اسی محور کے..... گرد لڑی گئی تھی اور اس میں فریقِ مقابل تھا نیشنلسٹ علماء کا گروہ۔ قائداعظمؒ کا دستِ ہُنر' ہندو کی شاطرانہ عیاری کا نقاب بڑی آسانی سے الٹ دیتا تھا۔ ان کا حسنِ استدلال' انگریز کے اعتراضات کا بھی بڑا مسکت جواب دیتا تھا لیکن علماء حضرات' طرح طرح کی مغالطہ آفرینیوں سے' عوام کے جذبات کو مشتعل کرتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ نہ اقبالؒ عوامی سطح پر جذبات کی لڑائی لڑنا جانتے تھے' نہ قائداعظمؒ۔ اس زمانے میں' عوام کے دلوں میں انگریز کے خلاف نفرت اس قدر شدید تھی کہ اگر کسی کے خلاف کہہ دیا جاتا کہ وہ ''انگریز نواز'' ہے تو عوام ''ٹوڈی بچہ' ہائے ہائے'' سے اس کی زندگی اجیرن کر دیتے۔ انہوں نے اقبالؒ اور قائداعظمؒ دونوں کے متعلق یہ مشہور کر رکھا تھا کہ یہ انگریز کے پٹھو ہیں اور تحریکِ پاکستان انگریز کی سازش کی تخلیق ہے۔ (مولانا) حسین احمد مدنی (مرحوم) اس باب میں پیش پیش تھے۔ وہ کہتے تھے:

جو لوگ مسلمانوں کو اس میدانِ سیاست (یعنی کانگریسی میدانِ سیاست) میں اُترنے سے روک رہے

ہیں اور متحدہ قومیت کی بھیانک صورت ظاہر کر کے نفرت دلا رہے ہیں' بلا شک وشبہ برطانیہ کی ایسی عظیم الشان خدمات سرانجام دے رہے ہیں جو اس کی افواج اور اسلحہ سے بھی انجام نہیں پا سکتیں۔

(پمفلٹ متحدہ قومیت اور اسلام' ص 76)

حتیٰ کہ انہوں نے حضرت علامہؒ کا نام لے کر کہا:

غرضیکہ جادوگرانِ برطانیہ نے اپنی ساحرانہ کارگزاریوں سے سرسید جیسے تجربہ کار' عقلمند شخص کو نہ صرف متحدہ قومیت سے بلکہ پالیٹکس اور آئینی جدوجہد سے بھی روکا اور اسی کے ذریعے سے مسلمانوں کو ہمیشہ سیاسیات سے الگ رکھوا کر بالکل نابلد اور ڈرپوک بنا دیا۔ پھر اگر ڈاکٹر اقبالؒ مرحوم اس سحر سے مسحور ہیں تو کیا تعجب ہے۔

(ایضاً' ص 74)

جب انہوں نے ''مسئلۂ قومیت'' کے سلسلے میں علامہ اقبالؒ کے ساتھ اپنی بحث میں اسی الزام کو دہرایا' تو انہوں نے اس کے جواب میں کہا تھا:

مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بندتوڑنا اور اس کے اقتدار کو ختم کرنا ہمارا فرض ہے لیکن اس آزادی سے ہمارا مقصد یہ نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں بلکہ اولین مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے۔ اس لئے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں جن پر انگریزی حکومت قائم ہے۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالاسلام بن جائے لیکن اگر آزادئ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر اب ہے ایسا ہی رہے یا اس سے بدتر بن جائے' تو مسلمان ایسی آزادئ وطن پر ہزار لعنت بھیجتا ہے۔ میں ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا' بولنا' روپیہ صرف کرنا' لاٹھیاں کھانا' جیل جانا' گولی کا نشانہ بننا' سب حرام سمجھتا ہوں۔ قطعاً حرام۔

(معرکۂ دین ووطن)

یہ الزامات ویسے ہی بڑے پوچ تھے۔ پھر واقعات ان کی اس طرح تردید کرتے گئے کہ کچھ عرصہ کے بعد یہ غیر مؤثر ہو گئے۔ اس کے بعد' ان حضرات نے اپنے ترکش کا آخری تیر نکالا اور کہا کہ مطالبۂ پاکستان کے حق میں جو یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اس

مملکت میں مسلمان' اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے' تو یہ دلیل بڑی بودی اور مغالطہ آفریں ہے۔ آزاد ہندوستان میں' مسلمانوں کے لئے اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے میں کوئی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ انہیں اعتقادات کی پوری پوری آزادی ہوگی۔ نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ جیسے احکام وفرائض کی ادائیگی میں کسی قسم کی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ انہیں شخصی قوانین (Personal Laws) پر عمل پیرا ہونے کی آزادی ہوگی۔۔۔ یعنی ان کے نکاح' طلاق' وراثت وغیرہ سے متعلق معاملات شریعت کے مطابق طے ہوں گے۔ جب یہاں مسلمانوں کو شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے اس قدر آزادی ہوگی' تو پھر ایک الگ مملکت قائم کرنے کی ضرورت کیا ہے؟ یہ ڈھونگ ہے۔ جناحؒ کے وکیلانہ حربے ہیں۔ ہندوستان میں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

ان کا یہ پراپیگنڈہ بڑا کارگر ثابت ہوتا تھا' اس لئے عوام (تو ایک طرف' عام تعلیم یافتہ) خواص تک کو یہ سمجھانا بڑا مشکل تھا کہ اسلام' اسی کا نام نہیں جسے یہ حضرات پیش کرتے ہیں۔ اسلام (بہ حیثیت نظامِ زندگی) اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے' جس کی ہندوستان میں تو ایک طرف' دنیا کی کسی غیر اسلامی مملکت میں بھی آزادی نہیں مل سکتی۔ اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان مختصر الفاظ میں بیان کیا تھا کہ: ؎

مُلّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

یہ تھی بنیادی وجۂ نزاع اور بنائے اختلاف۔ آپ طلوع اسلام کے اس دور کے فائل اٹھا کر دیکھئے۔ آپ کو صفحات کے صفحات اسی بحث سے لبریز نظر آئیں گے۔ اصل یہ ہے کہ یہ سوال تھا بھی بڑا لطیف اور دقیق۔ مسلمان ہزار سال سے اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتا چلا آ رہا تھا جسے یہ (علماء) حضرات اسلام کے نام سے پیش کرتے تھے اور جس کی آزادی کی ضمانت ہندو دے رہا تھا۔ سوال یہ نہیں تھا کہ جس قدر اسلام' یہ حضرات پیش کرتے تھے' اسلام اتنا ہی نہیں۔ جو کچھ بھی اسلام کے نام سے پیش کیا جاتا تھا' اس میں اس قدر غیر اسلامی (عجمی) عناصر شامل ہو چکے تھے کہ اصلی اسلام اس ملبہ کے نیچے دب کر رہ گیا تھا۔ مدفون اسلام کو اس ملبہ سے باہر نکالنا' بڑی کوہکنی اور خارہ شگافی چاہتا تھا۔ علامہ اقبالؒ نے اپنے الٰہ آباد کے خطبہ میں کہا تھا کہ پاکستان کی اسلامی مملکت کے قیام سے مقصود یہ ہے کہ اس سے اسلام پر سے وہ نقش مٹا دیا جا سکے گا جو عربی ملوکیت نے اس پر ثبت کر رکھا ہے۔ اس نقش کو مٹانا (یا سعید حلیمؒ پاشا کے الفاظ میں' اس قشر کو کھرچنا) بڑا ہمت طلب مرحلہ تھا' بالخصوص

جب مذہبی پیشوائیت پوری تندہی کے ساتھ اس کی مخالفت کرتی ہو اور اس کی پشت پر ہندو کی پوری تائید اور امداد موجود ہو۔

ان مخالفین میں اکثریت تو ان کی تھی جو دیانتداری (لیکن بر بنائے جہالت) اسی اسلام کو حقیقی اسلام سمجھتے تھے جو امت میں متوارث چلا آ رہا تھا لیکن ایک عنصر ایسا بھی تھا جو اپنے مخصوص مقاصد کے پیش نظر اقبالؒ یا قائداعظمؒ کے پیش کردہ اسلام کی مخالفت کرتا تھا اور یہی طبقہ زیادہ مؤثر اور فعال تھا۔ وہ اسلام جسے یہ حضرات پیش کرتے تھے' اس میں' اپنے دائرے کے اندر ان کی اپنی حکومت قائم رہتی تھی یعنی قوم اپنے مذہبی معاملات کے لئے ان کے فیصلوں اور فتوؤں کی محتاج رہتی تھی۔ انہیں یہ اقتدار انگریز کے زمانے میں بھی حاصل تھا اور ہندو بھی اسے قائم رکھنے کی ضمانت دیتا تھا۔ اس کے برعکس' حقیقی اسلام میں ان کا یہ اقتدار (بلکہ جداگانہ وجود ہی) ختم ہو جاتا تھا یعنی اس اسلام میں تھیاکریسی کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس باب میں نہ علامہ اقبالؒ نے کسی قسم کی مداہنت سے کام لیا' نہ قائداعظمؒ نے۔ انہوں نے نہایت واضح اور غیر مبہم الفاظ میں (بار بار) اس حقیقت کا اعلان کیا کہ پاکستان میں تھیاکریسی قطعاً نہیں ہوگی۔ علامہ اقبالؒ نے' اپنے خطبۂ الٰہ آباد سے بھی بہت پہلے' (مولانا) اکبر شاہ (نجیب آبادی) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا:

> آپ نے ٹھیک فرمایا ہے کہ پیشہ ور مولویوں کا اثر سرسید احمد خاں کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتوؤں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسہ میں پڑھا گیا تھا۔ انشاء اللہ شائع ہوگا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا۔ بہرحال اس تمام معاملے کے متعلق مفصل گفتگو ہو گی جب آپ لاہور تشریف لائیں گے۔ ہندوستان میں بالخصوص آج کل بہت سمجھ سوچ کر قدم اٹھانا ہوگا۔

(انوار اقبالؒ۔ شائع کردہ اقبالؒ اکیڈمی' ص 317)

انہوں نے 1932ء میں اپنے ایک بیان میں جو روزنامہ انقلاب (لاہور) کی 23 مارچ کی اشاعت میں شائع ہوا تھا' قوم کو مخاطب کر کے فرمایا تھا:

> تمہارے دین کی یہ عظیم الشان بلند فطری' مُلّاؤں اور فقیہوں کے فرسودہ اوہام میں جکڑی ہوئی ہے اور آزادی چاہتی ہے۔ روحانی اعتبار سے ہم حالات و جذبات کے ایک قید خانے میں محبوس ہیں جو

صدیوں کی مدت میں ہم نے اپنے گرد خود تعمیر کر لیا ہے اور ہم بوڑھوں کے لئے شرم کا مقام ہے کہ ہم نوجوانوں کو ان اقتصادی' سیاسی' بلکہ مذہبی بحرانوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ بنا سکے جو زمانہ حاضر میں آنے والے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ساری قوم کی موجودہ ذہنیت کو یکسر تبدیل کر دیا جائے تاکہ وہ پھر نئی آرزوؤں' نئی تمناؤں اور نئے نصب العین کی اُمنگ کو محسوس کرنے لگ جائے۔

(بحوالہ طلوع اسلام' مئی 1978ء)

یہ تو ان کے نثری بیانات کے اقتباس ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جو کچھ اور جس قدر ''مُلّا'' کے خلاف کہا ہے' وہ درحقیقت' مُلّا کے تصور کے اسلام اور تھیاکریسی کے خلاف جہاد ہے۔

اقبالؒ کے بعد قائداعظمؒ کی طرف آیئے تو انہوں نے بھی' لگی لپٹی رکھے بغیر' صاف صاف الفاظ میں کہا کہ تحریکِ پاکستان کا اہم مقصد' قوم کو مذہبی پیشوائیت کے رجعت پسندانہ اسلام کے چنگل سے نجات دلانا ہے۔ انہوں نے 5 فروری 1938ء کو مسلم یونیورسٹی' علی گڑھ کی یونین سے خطاب کرتے ہوئے' نوجوان طالب علموں سے کہا:

مسلم لیگ نے کم از کم ایک کام تو کر دیا ہے اور وہ یہ کہ اس نے تمہیں مسلمانوں کے رجعت پسند عناصر کے چنگل سے چھڑا دیا ہے اور اس خیال کو عام کر دیا ہے کہ جو لوگ خودغرضی کا مفاد پرستانہ کھیل' کھیل رہے ہیں' وہ قوم کے غدار ہیں۔ اس نے بلاشک وشبہ تمہیں اس ناخوش آئند و غیر مطلوب عنصر کی جکڑ بندیوں سے آزاد کر دیا ہے جسے مولوی یا مولانا کہتے ہیں۔

(تقاریر قائداعظمؒ حصہ اول' ص 48)

انہوں نے' 11 اپریل 1946ء کو دہلی میں' مسلم لیجسلیٹرز کنونشن کے آخری اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا:

اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہم کس مقصد کے لئے لڑائی لڑ رہے ہیں۔ ہمارا نصب العین کیا ہے۔ ہمارا نصب العین تھیاکریسی نہیں۔ ہم تھیاکریٹک اسٹیٹ بنانا نہیں چاہتے۔

(تقاریر۔ جلد دوم' ص 386)

انہوں نے تشکیل پاکستان کے بعد بھی' اس حقیقت کو علی الاعلان واضح کیا تھا کہ پاکستان میں مذہبی پیشواؤں کی حکومت نہیں ہو گی۔ انہوں نے' فروری 1948ء میں' اہل امریکہ کے نام اپنے براڈکاسٹ میں کہا تھا:

پاکستان کی مجلسِ آئین ساز نے ابھی پاکستان کا دستور مرتب کرنا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس کی آخری

شکل کیا ہوگی لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ اسلام کے بنیادی اصولوں کا آئینہ دار جمہوری انداز کا ہوگا۔ اسلام کے یہ اصول آج بھی اسی طرح عملی زندگی پر منطبق ہو سکتے ہیں جس طرح وہ تیرہ سو سال پہلے ہو سکتے تھے۔ اسلام نے ہمیں وحدتِ انسانیت اور ہر ایک کے ساتھ عدل و دیانت کی تعلیم دی ہے۔ آئینِ پاکستان کے مرتب کرنے میں جو ذمہ داریاں اور فرائض ہم پر عائد ہوتے ہیں ان کا ہم پورا پورا احساس رکھتے ہیں۔ کچھ بھی ہو یہ مسلمہ بات ہے کہ پاکستان میں کسی صورت میں بھی تھیاکریسی رائج نہیں ہوگی جس میں حکومت مذہبی پیشواؤں کے ہاتھ میں دے دی جاتی ہے کہ وہ (بزعمِ خویش) خدائی مشن کو پورا کریں۔

(تقاریر بحیثیت گورنر جنرل' ص 65)

علامہ اقبالؒ اور قائداعظمؒ کی ان تصریحات کے بعد' یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ علماء حضرات' مطالبۂ پاکستان کی مخالفت کیوں کرتے تھے۔ یہ اسلام کا سوال نہیں تھا۔ ان کے ذاتی اقتدار کا سوال تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ اقتدار جو انہیں مسلمان سلاطین کی ہزار سالہ سیکولر حکومت کے تحت حاصل رہا۔ جسے انگریز نے بھی اپنے عہدِ حکومت میں برقرار رکھا اور جسے علیٰ حالہٖ رکھنے کی ضمانت ہندو دے رہا تھا' پاکستان میں (صحیح معنوں میں) اسلامی حکومت میں' نہ صرف یہ کہ وہ ان سے چھن جائے گا' بلکہ ان کا جداگانہ تشخص بھی باقی نہیں رہے گا۔ بنابریں' فطری طور پر ان کی خواہش اور کوشش یہی تھی کہ پاکستان وجود میں نہ آنے پائے۔

اقبالؒ یا قائداعظمؒ نے یہی نہیں کہا تھا کہ پاکستان میں تھیاکریسی نہیں ہوگی۔ انہوں نے مثبت طور پر یہ بھی واضح کر دیا تھا کہ اس مملکت میں' حکومت قرآن کے مطابق قائم ہوگی۔ علامہ اقبالؒ کا تو خیر سارا کلام اسی نقطہ کی وضاحت ہے کہ' اسلامی حکومت' قرآن کی حکمرانی کا نام ہے جو حسبنا کتاب اللہ' کہنے والوں کے ہاتھوں متشکل ہوتی ہے' قائداعظمؒ نے بھی اس باب میں کسی قسم کا شک وشبہ یا ابہام نہیں رہنے دیا تھا۔ حیدرآباد (دکن) میں ان کا وہ اعلان' جو طلوع اسلام کے صفحات پر بار بار شائع ہوتا چلا آ رہا ہے' اس حقیقت کا آئینہ دار ہے۔ انہوں نے فرمایا تھا:

اسلامی مملکت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی

سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لئے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔

[1] (اورینٹ پریس، بحوالہ روزنامہ انقلاب، لاہور، مورخہ 8 جنوری 1942ء، ص 3)

اس پر وہاں کے طلباء نے (جنہیں یہ انٹرویو دیا گیا تھا) کہا کہ جب یہ صورت ہے تو پھر مسلم لیگ اپنی تحریک کی مذہبی تعبیر و تشریح کیوں نہیں کرتی۔ اس کے جواب میں، قائداعظمؒ نے فرمایا تھا:

دِقت یہ ہے کہ جب اس جدوجہد کو مذہب سے تعبیر کیجئے تو ہمارے علماء کی ایک جماعت بغیر اس بات کے سمجھنے کے کہ کام کی نوعیت، تقسیمِ عمل اور اس کے اصلی حدود کیا ہیں، ان امور کو صرف چند مولویوں کا اجارہ خیال کر لیتی ہے اور اپنے حلقہ سے باہر، اہلیت و استعداد کے باوجود، مجھ میں یا آپ میں، یعنی اپنے سوا کسی اور میں، اس خدمت کے سرانجام دینے کی کوئی صورت نہیں دیکھتی۔ حالانکہ اس منصب کی بجا آوری کے لئے جن اجتہادی صلاحیتوں کی ضرورت ہے، انہیں مَیں ان مولوی صاحبان میں (الا ماشاءاللہ) نہیں پاتا اور (مشکل اندر مشکل یہ کہ) وہ اس مشن کی تکمیل میں دوسروں کی صلاحیتوں سے کام لینے کا سلیقہ بھی نہیں رکھتے۔

☆☆☆

ان علماء نے تحریکِ پاکستان کے دوران اپنی مخالفت مسلسل جاری رکھی لیکن جب ان کی مخالفت کے علی الرغم پاکستان وجود میں آ گیا تو انہوں نے ایک دوسرا راستہ اختیار کر لیا۔ یہ ہجوم کر کے پاکستان آ گئے۔ واضح رہے کہ ان علماء میں

---

[1] ماہنامہ طلوعِ اسلام کے پرانے شماروں اور طلوع اسلام ٹرسٹ کی شائع شدہ کتب میں قائداعظمؒ کے اس بیان کی اشاعت کی تاریخ روزنامہ انقلاب کے حوالہ کے ساتھ ہمیشہ 8 فروری 1942ء چھپتی رہی ہے۔ محترم مقبول محمود فرحت صاحب (لندن) جب پاکستان تشریف لائے تو انہیں روزنامہ انقلاب کے متعلقہ شمارہ کی تلاش میں کافی مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ اس ضمن میں مسلسل کاوش اور لائبریریوں میں روزنامہ انقلاب کے پرانے فائلز دیکھنے کے بعد انہیں بالآخر اخبار کی متعلقہ کاپی لاہور میوزیم لائبریری میں دستیاب ہوگئی جس کے سرورق پر 8 دسمبر 1942ء غلط پرنٹ ہوا تھا۔ لاہور میوزیم لائبریری نے اس کی تصحیح کر کے 8 جنوری 1942ء جلد 16 بروز پنج شنبہ 20 ذوالحجہ 1360ھ کر دیا ہوا ہے۔ کیونکہ اس دن کے متعلقہ اخبار کے دیگر تمام صفحات پر یہی تاریخ مندرج ہے۔ ہم محترم مقبول محمود فرحت صاحب کے تہہِ دل سے مشکور ہیں۔ ان کی یہ تحقیق انیق بہت ہی فائدہ مند ہے، کیونکہ بعض لوگ قائداعظمؒ کے ان الفاظ کی صحت ہی کو مشکوک قرار دے دیتے تھے۔ روزنامہ انقلاب کی اس اشاعت کی تاریخ کی درستی پاکستانیات کے طالب علموں کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ سے کم نہیں ہے۔ (مدیر)

گنتی کے چند ایسے تھے جنہوں نے تحریکِ پاکستان کا ساتھ دیا تھا۔ ان کی معتدبہ اکثریت اس کے مخالفین کی تھی۔ یہ پاکستان آ گئے۔ یہاں پہنچ کر انہوں نے مطالبہ شروع کر دیا کہ:

(i) پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ہے۔

(ii) لہٰذا' یہاں اسلامی قوانین نافذ کرو۔

(iii) اسلامی احکام وقوانین کا علم اربابِ حکومت کو نہیں' علماء کو ہے۔ لہٰذا زمامِ اقتدار علماء کے ہاتھ میں دو۔

یعنی ہندوستان میں رہتے ہوئے اگر ان کا اقتدار' نماز' روزہ یا شخصی قوانین تک محدود رہنا تھا' تو یہاں ان کے عزائم پوری کی پوری حکومت پر قبضہ کرنا تھا۔ جب مودودی مرحوم سے کہا گیا تھا کہ اسلامی نظام یا دستور مرتب نہیں ہو رہا' تو انہوں نے کہا تھا کہ اقتدار ان کے ہاتھ میں دو جو جانتے ہیں کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔ پھر دیکھو یہ نظام اور دستور کس طرح مرتب نہیں ہوتا!

اگر اقبالؒ یا قائداعظمؒ زندہ ہوتے تو وہ ان کے اس مطالبہ کا جواب ویسے ہی دیتے' جیسے وہ تحریکِ پاکستان کے دوران دیا کرتے تھے۔۔۔ یعنی وہ قرآنی دستور و نظام مرتب کر کے دے دیتے۔ لیکن (قوم اور اس مملکت کی بدقسمتی تھی کہ) وہ اس سے پہلے ہی دنیا سے چلے گئے۔

ہم گذشتہ اربابِ اقتدار میں سے کسی کی بھی مدافعت نہیں کرنا چاہتے' لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جسے یہ حضرات اسلامی قوانین کہہ کر پکارتے ہیں' وہ اس دور میں ناممکن العمل ہیں۔ لہٰذا' وہ اس مطالبہ کو منظور نہیں کرتے تھے۔ اس سے انہیں' ان کے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا نہایت عمدہ موقعہ ہاتھ آ جاتا تھا۔۔۔ اور پراپیگنڈہ کی جس قدر منظّم اور مؤثر مشینری ان حضرات کے پاس ہے' دنیا کی کوئی حکومت بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ آپ ذرا اس پر نگاہ ڈالئے کہ پاکستان کے ہر گاؤں' ہر قصبہ' ہر قریہ' ہر شہر اور اس کی ہر گلی اور ہر محلّہ میں مسجد (بلکہ مسجدیں) موجود ہیں۔ ان میں' روزانہ پانچ مرتبہ اور ہر ہفتہ' کسی اعلان' اشتہار یا دعوت کے بغیر لوگ ازخود جمع ہو جاتے ہیں۔ لہٰذا' جس بات کو یہ پھیلانا چاہیں وہ ایک دن میں' بیک وقت' ملک کے کونے کونے تک پہنچ جاتی ہے۔ سوچئے کہ اس جیسی منظّم پراپیگنڈہ کی مشینری دنیا کی کسی حکومت کے پاس بھی ہے؟ اس مشینری کی رُو سے یہ حضرات ہر حکومت کے خلاف پراپیگنڈہ کرتے رہے کہ اربابِ اقتدار ملحد ہیں۔ بے دین ہیں۔ فاسق و فاجر ہیں۔ یہ احکام شریعت نافذ نہیں کرنا چاہتے۔

ان کا مطالبہ کس طرح ناممکن العمل تھا اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ یہ آج تک پکارتے چلے آ رہے ہیں کہ 1951ء میں' ملک کے تمام فرقوں کے نمائندہ علماء نے ایک متفقہ منشور شائع کیا تھا جس میں اسلامی نظام اور شریعت کی وضاحت کی گئی تھی اور اس کے مطابق نظامِ حکومت قائم کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس منشور میں ''متفق علیہ'' مطالبہ یہ تھا کہ ملک کے قوانین ''کتاب وسنت'' کے مطابق مرتب ہونے چاہئیں۔ بیس سال تک یہ حضرات اس مطالبہ کو دہراتے رہے اور

ہر حکومت کو کوستے رہے کہ یہ لوگ ''کتاب وسنت'' کے مطابق قوانین مرتب نہیں کرتے۔ بیس سال کے مسلسل پراپیگنڈہ کے بعد' اس منشور پر دستخط کرنے والوں میں سے (اگر سب سے زیادہ مشہور نہیں' تو مشہور تر) شخصیت' سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) نے اعتراف اور اعلان کیا کہ کتاب وسنت کے مطابق پبلک لاز کا کوئی ایسا ضابطہ مرتب نہیں ہوسکتا جسے تمام فرقے اسلامی تسلیم کرلیں۔

یعنی جب ارباب حکومت اس مطالبہ کو ناممکن العمل کہتے تھے تو انہیں ملحد و بے دین کہا جاتا تھا۔ لیکن جب مودودی (مرحوم) نے اسے ناممکن العمل قرار دیا تو ان میں سے کسی نے ان کے خلاف ایک لفظ تک نہ کہا۔ اس لئے کہ سب جانتے تھے کہ مودودی (مرحوم) نے ٹھیک کہا ہے۔ یہ مطالبہ واقعی ناممکن العمل ہے!

جب مودودی (مرحوم) سے پوچھا گیا کہ اگر ''کتاب وسنت'' کے مطابق کوئی متفق علیہ ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہوسکتا تو پھر کیا کیا جائے؟ انہوں نے کہا کہ ملک میں فقہ حنفی نافذ کردی جائے۔ (حالانکہ اس فقہ کہ وہ خود ''منجمد شاستر'' قرار دے چکے تھے)۔ چونکہ مطالبہ پاکستان کی مخالفت کرنے والے علماء کی اکثریت فقہ حنفی کی پابند تھی' اس لئے انہوں نے اس تجویز کا بڑھ چڑھ کر استقبال کیا۔ اس طرح یہاں وہ تھیاکریسی مسلط ہوگئی جسے ختم کرنے کے لئے حصولِ پاکستان کے لئے جدوجہد کی گئی تھی اور یوں ان علماء کی وہ شکست جو انہیں تشکیلِ پاکستان کی رُو سے اٹھانی پڑی تھی' مبدل بہ فتح ہوگئی۔ اس سے انہیں کوئی غرض نہیں کہ یہ (ہزار سال پہلے کے انسانوں کے وضع کردہ احکام) ممکن العمل بھی ہیں یا نہیں' اور جو فرقے اس فقہ کو اسلامی تسلیم نہیں کرتے' ان کا ان کے خلاف کیا ردِعمل ہوگا اور ملک کی سالمیت پر اس کا کیا اثر پڑے گا۔ ایران کی مثال ہمارے سامنے ہے۔

یہ ہیں وہ حقائق جن کی روشنی میں ہم نے کہا تھا کہ وہ یومِ آزادی' جس کی آمد آمد کبھی روزِ عید سے بھی زیادہ وجۂ شادمانی ہوتی تھی' اب اس کی کیفیت یہ ہے کہ ؎

یاد اس کی آئی' غم تازہ ہوا
غم کسے کہتے ہیں' اندازہ ہوا

بایں ہمہ' ہماری اب بھی یہی دعا اور کوشش ہے کہ خدا اس خطۂ زمین کو قائم ودائم اور مستحکم و پائندہ رکھے' کہ اس کے وجود کے ساتھ' قرآنی نظام کی امیدیں وابستہ ہیں۔

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں تیرا نام رہے
غیر ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے جام رہے

لہٰذا' ہم اس ماہِ صیام میں یومِ آزادی کا بہ صمیمِ قلب استقبال کرتے ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

(ادارہ)

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا.....

اپریل 1980ء میں مرکزی حکومتِ پاکستان کی وزارتِ مالیات نے اس مقصد کے لئے ایک کمیٹی مقرر کی کہ وہ حکومت کی راہنمائی کے لئے اسلامی اصلاحات کا ایجنڈا مرتب کرے۔ اسے (Committee On Islamisation) سے تعبیر کیا گیا۔ (کچھ دنوں سے ہمارے ہاں ''اسلامائی زیشن'' کی اصطلاح عام طور پر استعمال ہو رہی ہے۔ اس کا عام ترجمہ ''مسلمان کرنا'' ہو سکتا ہے' لیکن یہ الفاظ اس اصطلاح کا صحیح مفہوم ادا نہیں کر سکتے۔ کسی غیر اسلامی نظریہ' نظام یا سسٹم کو ''مسلماں کرنا'' بے معنی ہے۔ غیر اسلامی نظریات وغیرہ کو اسلامی نظریات سے بدلا تو جا سکتا ہے۔ انہیں ''مسلمان'' نہیں کیا جا سکتا۔ جس طرح (Nationalisation) کا عام ترجمہ ''قومیانہ'' کیا جاتا ہے' (Islamisation) کا ترجمہ (شاید) ''اسلامیانہ'' کیا جائے۔)

یہ کمیٹی حسبِ ذیل حضرات پر مشتمل تھی:

1- پروفیسر سید نواب حیدر نقوی۔ ڈائریکٹر' پاکستان انسٹیٹیوٹ آف ڈویلپمنٹ اکنامکس' اسلام آباد۔

2- مسٹر ایچ۔ یو۔ بیگ' سیکرٹری منسٹری آف فنانس' اسلام آباد۔

3- پروفیسر رفیق احمد' پرووائس چانسلر' پنجاب یونیورسٹی' لاہور۔

4- پروفیسر میاں ایم۔ نذیر' پروفیسر آف اکنامکس' پشاور یونیورسٹی' پشاور۔

اس کمیٹی نے اپنی رپورٹ مئی 1980ء میں پیش کر دی تھی' لیکن جہاں تک' ہمارے علم میں ہے' یہ پبلک کے سامنے اس وقت آئی جب اسے اسلام آباد سے شائع ہونے والے روزنامہ ''دی مسلم'' نے اپنی اشاعات بابت (6-7-11-12/نومبر 1980ء) میں بالاقساط شائع کیا۔ اس کے بعد اسی روزنامہ کی 27 نومبر کی اشاعت میں اس پر تفصیلی تبصرہ بھی شائع ہوا۔ آئندہ صفحات میں ہم اس رپورٹ پر اپنی گذارشات پیش کریں گے۔

ہم نہیں کہہ سکتے کہ وہ مصلحتیں (یا مجبوریاں) کیا تھیں جن کی بنا پر یہ رپورٹ اس قدر تاخیر کے ساتھ منظرِ عام پر آ سکی حالانکہ یہ اس قدر اہم اور معلومات افزا تھی کہ نہ صرف یہ کہ اسے بلا تاخیر پبلک کے سامنے آنا چاہئے تھا بلکہ اس کی زیادہ سے زیادہ اشاعت ہونی چاہئے تھی۔

ہم نے اس رپورٹ کا مطالعہ' مسرت اور تعجب کے ملے جلے جذبات سے کیا۔ مسرت اس بات سے کہ رپورٹ فی الجملہ قرآن مجید کے ارشادات پر مبنی ہے اور تعجب اس پر کہ (جہاں تک ہماری معلومات ہماری راہنمائی کرتی ہیں) یہ پہلا موقعہ تھا کہ ایوانات حکومت سے قرآن کریم کی آواز اس انداز سے بلند ہوئی اور وہ بھی اقتصادیات (اکنامکس) کے سلسلہ میں۔۔۔ وہ اکنامکس جس کے متعلق عام تاثر یہ ہے کہ یہ عصرِ حاضر کی ان اولیات میں سے ہے جن کا مذہب سے تعلق نہیں۔ ایک ایسے مسئلہ کا مطالعہ اور تجزیہ اسلامی نقطۂ نگاہ سے کرنا اور پھر اس کا حل قرآن کریم کی راہنمائی میں پیش کرنا' باعثِ مسرت اور درخورِ تہنیت ہے۔ ہم اس پر اس کمیٹی کے چیئرمین اور ارکان کی خدمت میں دلی ہدیۂ تبریک پیش کرتے ہیں۔

اب آیئے رپورٹ کی طرف جس کے متعلقہ حصص کا رواں ترجمہ پیش کیا جائے گا۔

☆☆☆

رپورٹ کا ''مطلعِ انوار'' ہے:

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (3:180)-

ارض وسمٰوٰت اللہ کی ملکیت ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کے معاشی نظام کی یہی اساس اور بنیاد ہے۔ اس کے بعد جو کچھ کہا جائے' وہ اسی نقطہ کی تفسیر ہوگا۔ کس قدر حسین اور درخشندہ ہے یہ آغاز!

☆☆☆

(1) اسلامی نظامِ معیشت کا مقصود و منتہیٰ قرآنِ کریم کی اس آیۂ جلیلہ کی روشنی میں بتایا گیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

کرۂ ارض پر کوئی ذی حیات ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری خدا پر نہ ہو۔ (11:6)-

(رپورٹ' ص5)

(ضمناً) رپورٹ میں طباعت کی غلطی سے اس آیت کا حوالہ (9:6) دیا گیا ہے۔ صحیح حوالہ (11:6) ہے۔ رپورٹ میں اس امر کی وضاحت کی گئی ہے کہ خدا کی یہ ذمہ داری اسلامی نظام حکومت کی طرف سے پوری ہوتی ہے۔ (صفحہ 16)۔

(2) دوسرے مقام پر اس اجمال کی تفصیل ان الفاظ میں دی گئی ہے:

اسلامی نظامِ معیشت کی امتیازی خصوصیت' پرائیویٹ پراپرٹی (ذاتی املاک) کے متعلق اس کے نقطۂ نگاہ میں مضمر ہے۔ اس خصوصیت' کی رو سے' دولت۔۔۔ تمام کی تمام خدا کی ملکیت ہوتی ہے اور انسان اس کا امین ہوتا ہے نہ کہ مالک۔ یہ اسلام کی منفرد خصوصیت ہے۔ ایک طرف یہ نظام' سرمایہ داری سے یکسر متمیز ہے جس میں ذاتی ملکیت کو مقدس قرار دیا جاتا ہے اور اس کا بہرحال تحفظ ضروری ہوتا ہے اور دوسری طرف سوشلزم سے متمیز جس میں دولت کو مملکت کی ملکیت ٹھہرایا جاتا ہے۔

(صفحہ 3)

اس بنا پر کہا گیا ہے کہ:

معاشی نظام کے اسلامیانے کے پروگرام میں سب سے اہم اور بنیادی سوال ذاتی ملکیت کی انسٹیٹیوشن کو ''مسلمان کرنا'' ہے۔ اس انسٹیٹیوشن کی بنیاد نظامِ جاگیرداری اور سرمایہ داری پر ہے۔ اس سلسلہ میں زمین کی انفرادی ملکیت کا سوال سب سے اہم ہے۔ یہ نہ صرف ناہمواریوں کا سرچشمہ ہے' بلکہ معاشرتی فسادات اور اخلاقی انحطاط کا موجب بھی ہے۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کی اصلاح اس طرح کی جائے کہ یہ ''ملکیت'' کے دائرے سے نکل کر ''امانت'' کے احاطہ میں آ جائے۔

(صفحہ 13)

(3) رپورٹ کی تمام تجاویز یا سفارشات جس محور کے گرد گردش کرتی ہیں' وہ ہے ''عدل اور احسان''۔ رپورٹ کا شاید ہی کوئی صفحہ ایسا ہو جس پر کسی نہ کسی بحث کے ضمن میں یہ آیتِ قرآنی: (ان اللہ یامر بالعدل والاحسان) نہ آتی ہو۔ اس میں ''عدل'' کے مفہوم کو زیادہ وسعت دی گئی ہے۔ یعنی ہر شعبہ میں توازن۔۔۔ پیداوار' صَرف اور تقسیم کے تعلقات کا عدل و توازن کی بنیادوں پر استوار کرنا اور احسان کا مفہوم یہ۔۔۔ کہ جو شخص اقتصادی بدحالی کا شکار ہو جائے' اسے اس پستی سے نکالا جائے۔ (صفحہ IV)۔

(ضمناً) رپورٹ میں احسان کو ہر جگہ (Ahsan) لکھا گیا ہے۔ یہ غالباً طباعت کی غلطی ہے۔ صحیح تلفظ (Ihsan) ہے۔ (16:90)

''عدل اور احسان'' کے قرآنی اصول کو عمل میں لانے کے سلسلہ میں رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ دولت کی تقسیم اس طرح کی جائے کہ وہ اوپر کے طبقہ ہی میں گردش نہ کرتی رہے: كَيْ لَا يَكُونَ دُولَةً بَيْنَ الْأَغْنِيَاءِ مِنكُمْ (59:7)۔

(رپورٹ، صفحہ IV)۔

اس کا مقصد یہ ہے کہ دولت کی ازسرِنو تقسیم اس انداز سے کی جائے کہ ''عدل واحسان'' کا تقاضا پورا ہو۔ نعمائے خداوندی پر کسی ایک طبقہ کی اجارہ داری یکسر خلافِ اسلام ہے۔ (صفحہ IV)۔

احسان کا تقاضا پورا کرنے کے سلسلے میں کہا گیا ہے کہ قرآن کریم کا واضح ارشاد ہے کہ: وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ (51:19) - دولت مندوں کی دولت میں ان لوگوں کا حق ہے جو معاشی طور پر خود کفیل نہ ہوں۔ (صفحہ IV)۔ اس ارشادِ خداوندی کی تعمیل کے لئے تمام دولت کی، ازسرِنو تقسیم ضروری ہوگی۔ (صفحہ 7)۔

(4) دولت کی اس تقسیمِ نو کا اصول انفاق ہے۔ یعنی

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ (2:219)-

(اے رسول!) تجھ سے یہ پوچھتے ہیں کہ ہم کس قدر (دوسروں کی ضروریات کے لئے) دے دیں۔ ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری اپنی ضرورت سے زائد ہے، وہ سب۔

رپورٹ میں اس بنیادی نقطہ پر بڑا زور دیا گیا ہے۔ (صفحہ 20)۔

(5) دولت کی اس طرح تقسیمِ نو کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشرہ میں امیر اور غریب کے طبقات ختم ہو جائیں گے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے:

> اس میں شبہ نہیں کہ آغازِ کار کے وقت غریب اور امیر کے طبقات دوش بدوش موجود ہونگے، لیکن قرآنی اصولوں کے مطابق دولت کی ازسرِنو تقسیم کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اولاً ان کے درمیان موجودہ خلیج رفتہ رفتہ کم ہوتی جائے گی، اور آخرالامر ان طبقات کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ دولت کی تقسیمِ نو اس لئے بھی اہم ہے کہ ہم اس وقت غیر اسلامی معاشی نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں جس میں دولت کی غلط تقسیم کی وجہ سے شدید ناہمواریاں پیدا ہو چکی ہیں۔ زمین کی ذاتی ملکیت اس کا بہت بڑا سبب ہے۔ اسلامی نظامِ معیشت کی طرف جانے کے لئے قدم اول یہ ہونا چاہئے کہ شہری اور دیہاتی دولت کی تقسیم عدل واحسان کی بنا پر کی جائے۔ اس کے لئے فیصلہ کن اقدامات کی ضرورت ہوگی۔ یہ سمجھنا کہ معاشرہ میں وسیع پیمانے پر دولت کو ازسرِنو تقسیم کرنے کے سلسلہ میں کچھ نہیں کیا جا سکتا، یہ اسی طرح چند

خاندانوں میں مقبوض رہے گی اور وراثتاً آگے منتقل ہوتی جائے گی' بالفاظِ دیگر یہ کہنا ہے کہ دولت کی موجودہ ناہموار تقسیم اسلام کے تقاضے کے مطابق ہے۔ یہ بڑا باطل (Absurd) تصور ہے۔ (صفحہ 4)۔

(6) رپورٹ میں اس حقیقت کی بھی وضاحت کی گئی ہے کہ انسانی مساوات سے مراد محض ''روٹی'' کی مساویانہ (یا حسبِ ضرورت) تقسیم نہیں۔ اس سے مراد ان تمام مواقع اور سہولتوں کا مساویانہ مہیا کرنا ہے جن سے انسانی صلاحیتوں کی نمود اور نشوونما ہوتی ہے۔ رپورٹ میں ہے:

عدل سے مراد' ان مواقع کا مساویانہ مہیا کرنا ہے جن سے انسان کی داخلی صلاحیتیں نشوونما پاتی ہیں۔ (صفحہ 8) اس کے لئے عالمگیر اور مفت تعلیم لازمی ہے۔

ربٰو اور زکوٰۃ

(7) آج کل یہ غلط فہمی عام ہے کہ ربٰو' سود کو کہتے ہیں اور اگر سود ختم کر دیا جائے تو سارا اقتصادی نظام اسلامی ہو جائے گا۔ رپورٹ میں اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لئے بڑی تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ تمہید میں کہا گیا ہے:

نظامِ سرمایہ داری کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا اور یہ سمجھنا کہ سود کو ختم کر دینے سے تمام مسائل حل ہو جائیں گے اور ہم اطمینان اور مسرت کی زندگی بسر کریں گے' شیخ چلی کی سی باتیں ہیں۔ یہ کمیٹی اس قسم کے مشورہ کو بالکلیہ مسترد کرتی ہے۔ کمیٹی کا نظریہ یہ ہے کہ اسلام جب ربٰو کو ختم کرتا ہے تو وہ درحقیقت پورے کے پورے نظامِ سرمایہ داری کو ختم کرتا ہے۔ (صفحہ V)۔

دوسرے مقام پر اس اجمال کی تفصیل دی گئی ہے اور ربٰو کے ساتھ (مروجہ) زکوٰۃ کو بھی زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ کمیٹی کی یہ بحث بڑی غور طلب ہے۔ لکھا ہے:

آج کل جس پروگرام کو اسلام کے اقتصادی نظام کے بلند دعاوی کے ساتھ عام کیا جا رہا ہے' وہ عوامی سطح پر زکوٰۃ کی ترویج اور سود کے خاتمہ سے متعلق نہایت مبہم اور غیر واضح خیالات کی نشر و اشاعت سے زیادہ کچھ نہیں۔ تاثر یہ دیا جا رہا ہے کہ اسلامی اقتصادیات بس ان دو عناصر کا نام ہے۔ (ان دو مقاصد کو حاصل کر لیا تو اسلامی اقتصادیات کا مسئلہ حل ہو گیا)۔ اس قسم کا دعویٰ غلط اور باطل ہے' اس

لئے کہ کسی اقتصادی نظام' بالخصوص اسلام کے اقتصادی نظام' کو اس قسم کے دو ایک اجزاء میں سمٹایا نہیں جا سکتا۔ علاوہ ازیں' اگر ایسا کرنا ممکن بھی ہو تو' پھر بھی یہ اشد ضروری ہے کہ اسلامی نظام کے ان اہم عناصر کا صحیح مفہوم سمجھا جائے۔ اس حقیقت کو بڑی آسانی سے واضح کیا جا سکتا ہے کہ اسلام جب ربٰو کو مسترد کرتا ہے' تو وہ درحقیقت پورے کے پورے سرمایہ دارانہ نظام کو مسترد کرتا ہے۔ وہ نظام جس کی بنیاد ہی غریبوں کی محنت کے استحصال پر قائم ہے۔ جہاں تک زکوٰۃ کا تعلق ہے' وہ اسلام کے بلند ترین مساویانہ اقتصادی فلسفہ کی ایک علامت ہے۔ (ایسی دقیق اور بلند حقیقت کو کیسے دلآویز انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ زکوٰۃ درحقیقت اسلام کے اقتصادی نظام مساوات کی علامت ہے جس کا مقصد یہ واضح کرتا ہے کہ اس نظام کا مقصد' نوع انسان کی صلاحیتوں کی نشوونما کے لئے ضروری اقدامات بروئے کار لانا ہے۔) اب یہ کہنا کہ سود مٹ گیا تو نظام سرمایہ داری مٹ جائے گا اور اگر امیروں سے اڑھائی فیصد کے حساب سے زکوٰۃ وصول کر لی تو اس سے غریبوں کی احتیاج اور افلاس کا مسئلہ حل ہو جائے گا اور امیروں اور غریبوں کے درمیان حائل خلیج پٹ جائے گی۔ دورِ حاضرہ میں ان معاشی مسائل کی اہمیت اور نوعیت کا صحیح اندازہ لگانے کے متعلق اپنی جہالت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ اتنا ہی نہیں' اس میں ایک خطرہ اور بھی ہے۔ اگر معاشی نظام کے اسلامیانے کے آغازِ کار کے سلسلہ میں' زکوٰۃ کی ترویج اور سود کے استیصال پر جس مبالغہ آمیز انداز سے زور دیا جا رہا ہے اور اس پروگرام کی تکمیل کے لئے دو تین سال کی مدت مقرر کی جا رہی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ معاشی اصلاحات کے متعلق پالیسی وضع کرنے میں انہی دو عناصر پر توجہ مرکوز رہے گی اور باقی تمام عناصر نظرانداز ہو جائیں گے۔ کوشش یہ کی جائے گی کہ کسی نہ کسی طرح ان دو اہداف (Targets) کو حاصل کر لیا جائے' خواہ ملک کی اقتصادیات پر اس کا کچھ ہی اثر کیوں نہ ہو اور جونہی یہ دو مقاصد حاصل ہو گئے' ہر ایک اس فریبِ نفس میں مبتلا ہو جائے گا کہ سارا مسئلہ حل ہو گیا۔ اب کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہ صورتِ حال بڑی خطرناک ہوگی۔ ذرا غور کیجئے کہ دنیا میں ایسے ملک بھی ہیں' جہاں زکوٰۃ کو مملکت کے تمام ٹیکسوں کی حیثیت سے نافذ کیا گیا ہے اور سود کو ختم کر دیا گیا ہے اور اس کے باوجود وہاں انتہائی معاشرتی ناانصافیاں عام ہیں' اور عدل و احسان کے تقاضوں کو کوئی پوچھتا تک نہیں۔ ایک ایسے ملک میں جہاں سرمایہ کی کمی ہو اور افلاس کی

زیادتی' جہاں اقتصادی استحصال عام ہو' اس قسم کی ناہمواریاں پیدا کرنے کا رجحان اور بھی زیادہ ہو گا۔ ربٰو کی جگہ ''منافع میں شراکت'' کا طریق' امیروں کے ہاتھوں غریبوں کے استحصال کے مزید دروازے کھول دے گا اور اڑھائی فیصد زکوٰۃ اقتصادی ناانصافیوں کو دور کرنے کے لئے قطعاً ناکافی ہوگی۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ جو اصلاحات اسلام کے نام سے نافذ کی جائیں' جب وہ اقتصادی استحصال کو دور کرنے میں ناکام رہ جائیں اور یہ ناکامی خود ان اصلاحات کی پیدا کردہ ہو' تو اس کے بعد اصلاحِ احوال کی صورت کیا ہوگی؟ اس سے حالت بد سے بدتر ہو جائے گی۔ ذرائع اور مقاصد کو کبھی باہمد گر مخلوط نہیں کرنا چاہئے۔ (صفحہ 10-11)۔

دوسرے مقام پر ربٰو اور ''منافع میں شراکت'' کے سوال پر بحث کرتے ہوئے رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

یہ کمیٹی بڑی شدت سے محسوس کرتی ہے کہ آج کل ربٰو کے متعلق جس انداز سے بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے' وہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ اس مسئلہ کی پیچیدہ نوعیت کو پوری طرح سمجھا ہی نہیں جا رہا۔ اولاً' یہ سمجھنا مبالغہ ہوگا کہ سود کی مروجہ مثبت شرح ہی اقتصادی ظلم اور استحصال کی وجہ ہے۔ اس کے برعکس' موجودہ نظامِ سرمایہ داری میں' اقتصادی استحصال کا اہم ترین سرچشمہ منافع ہے۔ بنابریں' جہاں یہ ضروری ہے کہ بتدریج ہی سہی' ربٰو کے ختم کرنے کے طریقے سوچے جائیں۔ کوئی ایسی تجویز جو ربٰو کو منافع کی شراکت میں تبدیل کر دے' اسلامی نظامِ معیشت کی طرف قطعاً قدم اول نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس نظام کا مدار عدل و احسان پر ہے' اور منافع کا تصور اس اصول کی نفی کر دیتا ہے۔ (صفحہ 20)۔

(مختصراً) جب تک موجودہ نظامِ سرمایہ داری قائم ہے' ربٰو کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تو نظامِ سرمایہ داری کے ختم ہونے سے ہی ختم ہو سکتا ہے۔ نہ ہی ربٰو کا نام ''منافع'' رکھنے سے سمجھا جا سکتا ہے کہ ربٰو ختم ہو گیا۔ اس قسم کی تجاویز کو یکسر مسترد کر دینا چاہئے۔ (صفحہ 27)۔

(8) رپورٹ میں اس حقیقت کی وضاحت بھی کی گئی ہے کہ اسلامی نظام' موجودہ نظام میں پیوند سازی سے قائم نہیں ہو سکے گا۔ اسے تو موجودہ نظام کی جگہ بالکلیہ نافذ کیا جائے گا۔ (صفحہ 12)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح کر دیا گیا ہے کہ موجودہ نظام کی جگہ' اسلامی نظام کو اس کی مکمل شکل میں قائم کرنے تک کا راستہ بتدریج طے کیا جائے گا۔ اس سے' نظر بظاہر یوں دکھائی دے گا گویا' معاشرہ کو اسلامیانے کا پروگرام بڑا سست رفتار ہے لیکن ایسا کرنا ناگزیر ہے۔ موجودہ ہمہ تن داغدار

معاشرہ کو ''عدل واحسان'' کی منزل تک قدم بقدم ہی پہنچایا جا سکے گا۔ (صفحہ 10)۔ اس عبوری دور میں انتہائی اقدامات کے بجائے' بر سبیل تنزل اختیار کردہ اقدامات کو قبول کرنا لازمی ہوگا۔ دیکھنا صرف یہ ہوگا کہ ہمارا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھ رہا ہے یا نہیں؟

ایک اشکال

(9) رپورٹ کے مطالعہ سے نظر آتا ہے کہ ''عدل واحسان'' کے اصول کے مطابق زمین اور مال کی از سرِ نو تقسیم کے راستے میں کمیٹی کو' اسلام کا قانونِ وراثت' سب سے بڑی رکاوٹ دکھائی دیتا ہے۔ (صفحہ 14)' بالخصوص زمین کے معاملہ میں۔ اس مشکل کے حل کے لئے انہوں نے مختلف اصلاحی اقدامات تجویز کئے ہیں لیکن وہ ان سے کُلی طور پر مطمئن نظر نہیں آتے۔

ہمیں حیرت ہے کہ جن حضرات نے قرآن کے معاشی نظام کو اس قدر واضح طور پر سمجھ لیا' قانونِ وراثت کا سوال ان کے لئے کس طرح لاینحل ہو گیا؟ جب انہوں نے اس حقیقت کو پا لیا کہ قرآن کی رو سے زمین پر ذاتی ملکیت ہو نہیں سکتی' تو اس کے لئے وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ قانونِ وراثت تو عبوری دور کا قانون ہے۔ اس دور کے لئے تدریجی اقدامات عمل میں لائے جا سکتے ہیں۔ اسلامی نظام کی آخری شکل میں' نہ زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت رہے گی' نہ وراثت کا سوال پیدا ہوگا۔

باقی رہا مال و دولت پر قانونِ وراثت کے اطلاق کا سوال' تو وراثت کا قانون' مَا تَرَکَ پر نافذ ہوتا ہے۔ یعنی جو کچھ کوئی چھوڑ کر مرے' اس کی تقسیم قانونِ وصیت اور وراثت کی رو سے ہوتی ہے۔ جب اسلام کے معاشی نظام میں' زائد از ضرورت مال و دولت کسی کے پاس رہے گا ہی نہیں' تو قانونِ وراثت کس دولت پر منطبق ہوگا؟

ان کے متعلق صرف عبوری دور کے لئے اصلاحات کی ضرورت ہوگی۔

(10) زمین کی مجوزہ اصلاحات کے سلسلہ میں' کمیٹی کی ایک سفارش البتہ تعجب انگیز اور نا قابلِ فہم ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ پٹہ (کاشت پر دی جانے والی زمین کا مقررہ کرایہ) تو ربٰو ہے لیکن زمین کو بٹائی پر دے دینا' ربٰو نہیں۔ جائز ہے۔ (صفحہ 14) ربٰو سے مراد ہے محض سرمایہ پر بڑھوتری۔ مزارعت میں' زمین کے مالک کا اصل (یعنی زمین) محفوظ رہتا ہے اور اس پر اسے منافع ملتا ہے۔ یہ منافع' سرمایہ پر بڑھوتری ہے' لہٰذا ربٰو خواہ وہ پٹہ کی شکل میں ہو اور خواہ بٹائی کی شکل میں۔ یہ تو عجیب سی شکل ہوگی کہ سرمایہ پر بڑھوتری نقدی کی شکل میں ہو تو حرام' اور اگر جنس کی شکل میں ہو تو جائز! ایسا کچھ تو فقہ کے

باب الحیل میں ہوتا ہے!!۔۔۔ جب کمیٹی کی تحقیق کی رو سے' کاروبار (مضاربت) میں منافع کی شراکت رہا ہے تو منافع میں اسی قسم کی شراکت مزارعت میں بھی ہوتی ہے۔ اس لئے اس باب میں مضاربت اور مزارعت میں کچھ فرق نہیں کیا جا سکتا۔ اسلامی نظام میں دونوں ناجائز ہوں گے۔

بہرحال' یہ دو ایک نکات تھے جن کی وضاحت ضروری تھی۔ اس کے بعد رپورٹ کے سلسلہ میں آگے بڑھئے:

(11) کمیٹی کو اس کا بھی احساس تھا کہ جو تجاویز اس نے پیش کی ہیں ان پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو سوشلزم یا کمیونزم ہے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے کہا ہے:

آپ جو معاشی نظام بھی وضع اور اختیار کریں گے اس کے کچھ گوشے ضرور ایسے ہوں گے جو دیگر معاشی نظاموں کے بعض گوشوں سے ملتے جلتے ہوں گے۔ (اور ایسا ہی اسلامی نظام میں بھی ہوگا) اس قسم کی جزوی مماثلت کسی نظام کو اس کی انفرادیت اور امتیازی خصوصیت سے محروم نہیں کر دیتی۔ ایک چیز ہوتی ہے کسی نظام کی اصل و اساس اور مقصود و منتہیٰ اور دوسری چیز ہوتی ہے۔ وہ طُرق اور ذرائع جن سے وہ مقصد حاصل ہوتا ہے۔ نظام ان دونوں کے امتزاج سے متشکل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے اسلامی نظام' دیگر نظام ہائے عالم سے' جن میں سوشلزم اور کمیونزم بھی شامل ہے' منفرد بھی ہے اور اسے اولیت کا شرف بھی حاصل ہے۔ (صفحات' 12-1 از 27)۔

یہ منفرد اور متمیز اسلامی نظام کیا ہے؟ اس سوال کا مکمل جواب اس وقت ہی دیا جا سکتا ہے جب عدل و انصاف کے اصولوں پر مبنی وہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہو کر سامنے آ جائے۔ (صفحہ 27)

اس وقت تک ہمیں اس نظام کی آخری منزل کی طرف نہایت استقامت کے ساتھ رواں دواں رہنا چاہئے اور اس نے اِفلاس' اِحتیاج اور معاشی استحصال کے مسائل کا جو حل پیش کیا ہے' سب سے پہلے انہیں اپنی گرفت میں لینا چاہئے۔ (صفحہ 27)

(12) اس کے ساتھ ہی رپورٹ میں اس امتیازی خصوصیت کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے جو اسلامی نظام کو دیگر نظامہائے عالم سے منفرد بنا دیتی ہے۔ تحریر ہے:

اسلام کا معاشی نظام' کوئی الگ تھلگ نظام نہیں۔ یہ درحقیقت اس کے پورے نظامِ زندگی کا ایک جزو' بلکہ اس کے اندر سمویا ہوا ہے۔ اس نظام کا اصل الاصول ''لینے'' کے بجائے ''دینا'' ہے۔ اس سے

انسان کی مادی اور روحانی' (انگریزی زبان کی یہ محدودیت ہے کہ اس میں مادہ کے مقابلہ میں (Spirit) کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور اس کا ترجمہ لامحالہ روحانی کیا جاتا ہے۔ اس سے مراد انسانی ذات کی نشوونما ہے نہ کہ خانقاہیت کی روحانیت)۔ دونوں زندگیاں سنور جاتی ہیں..... قرآن کا یہ پیغام (کہ حقیقی کامیابی کا راز دینے میں ہے) اس قدر انسانیت ساز ہونے کے باوجود ایسا انقلاب انگیز ہے کہ اس سے قلبِ انسانی کی گہرائیوں میں خوابیدہ جذبات بیدار ہو جاتے ہیں۔ جب انسان دیکھتا ہے کہ اس نظام میں اسے' غیر اسلامی نظامہائے عالم کے مقابلہ میں کس قدر فراواں اور زیادہ حاصل ہوتا ہے تو وہ اس کے قیام اور استحکام کے لئے بطیّب خاطر آمادہ اور روبعمل ہو جاتا ہے۔ موجودہ غیر اسلامی نظام کو اسلامی نظام میں تبدیل کرنے کے پروگرام میں کامیابی اسی طریق سے ہو سکے گی۔ یعنی عوام کے قلبی تعاون سے۔ یہ انقلاب' محض معاشی انقلاب نہیں ہوگا۔ یہ موجودہ غیر اسلامی معاشرہ کو اسلامی معاشرہ میں تبدیل کرنے کا ذریعہ ہوگا۔ (یوں اسلامی نظام ہماری پوری کی پوری زندگی کو محیط ہو جائے گا۔ (صفحہ VII)

دوسرے مقام پر اس کی مزید وضاحت ان الفاظ میں کی گئی ہے:

اسلام اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ انسان کو اگر علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا جائے تو وہ بڑا خودغرض اور بخیل ہوتا ہے۔ (17:100)- اس کے برعکس منشائے خداوندی یہ ہے کہ کرۂ ارض پر ہر ذی حیات کو سامانِ رزق مہیا ہو۔ (11:6) اس سے ظاہر ہے کہ بھوک اور افلاس۔۔۔ منشائے ایزدی نہیں۔ انسانوں کے خودساختہ نظاموں کی پیدا کردہ لعنتیں ہیں۔ اسلامی نظام کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے افرادِ معاشرہ کے دل میں ''لینے'' کے بجائے ''دینے'' کے جذبات بیدار ہوں' اور اس طرح معاشرہ خدا کی صفتِ ربوبیت کا آئینہ دار ہو جائے۔ تاکہ ہر فرد کو سامانِ زیست مہیا ہوتا رہے۔ پاکستان جیسے معاشروں میں' جو نظامِ سرمایہ داری کی بنیادوں پر استوار ہے' اسلامی نظام کے قیام کے لئے فضا ہموار کرنے کے لئے مملکت کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ' افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریاتِ زندگی۔۔۔ روٹی' صحت' تعلیم' سکونت وغیرہ۔۔۔ مہیا کرنے کی ذمہ داری کو پورا کرے۔ (صفحہ 5)۔

☆☆☆

یہ تھیں اس کمیٹی کی تجاویز یا سفارشات جسے حکومت نے اقتصادی اصلاحات کے لئے مقرر کیا تھا آپ ان تجاویز پر

غور کیجئے اور پھر دیکھئے کہ ان میں قرآن کریم کا معاشی نظام کس طرح جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تھا:

سَنُرِيهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ (41:53)۔

''ہم انفس و آفاق میں پھیلی ہوئی اپنی آیات نمایاں کرتے چلے جائیں گے تآنکہ یہ بات سب پر واضح ہو جائے کہ قرآن کا ہر دعویٰ مبنی بر حقیقت ہے۔''

جب روس نے نظامِ سرمایہ داری کے خلاف آواز اٹھائی تھی، تو علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ ؎

قوموں کی روش سے مجھے ہوتا ہے یہ معلوم
بے سود نہیں روس کی یہ گرمیٔ گفتار
اندیشہ ہوا شوخیٔ افکار پہ مجبور
فرسودہ طریقوں سے زمانہ ہوا بیزار!
انساں کی ہوس نے جنہیں رکھا تھا چھپا کر
کھلتے نظر آتے ہیں بتدریج وہ اسرار
قرآن میں ہو غوطہ زن اے مردِ مسلمان
اللہ کرے تجھ کو عطا جدتِ کردار
جو حرفِ قُلِ الْعَفْوَ میں پوشیدہ ہے اب تک
اِس دور میں شاید وہ حقیقت ہو نمودار!

(ضربِ کلیم، ص 138)

اس کے ساتھ ہی انہوں نے روس سے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ مارکسزم کے ہاں وہ اساسِ محکم نہیں جس پر معاشی نظام کی اس قدر عظیم عمارت استوار ہو سکے۔ وہ اساس خدا کی کتاب میں ملے گی۔ روس (اور اس کے بعد چین) نے اس اساس کو نہ اپنایا اور ان کا نظام ناکام رہ گیا لیکن زمانے کے تقاضے بدستور آگے بڑھ رہے ہیں اور یہ نظر آ رہا ہے کہ قرآن کے معاشی نظام کے لئے فضائے عالم ہموار ہو رہی ہے اور زیرِ نظر رپورٹ اس کی درخشاں شہادت ہے۔

اس کمیٹی نے قرآن کے معاشی نظام کی آخری منزل اور اس تک پہنچنے کے راستہ کی نشاندہی کرنے کا فریضہ بطریقِ احسن ادا کر دیا ہے جس کے لئے وہ مستحقِ مبارک باد ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان نشاناتِ راہ کا اتباع کرتے ہوئے کاروانِ ملت کو اس منزل تک لے جانے کی سعادت کس کے حصے میں آتی ہے؟ یہ حقیقت ہے کہ اسلامی نظام کے قیام کے پروگرام کا

آغاز اقتصادی انقلاب سے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بھوک اور خوف کو عذاب سے تعبیر کیا ہے۔(16:112)- سو، جو قوم عذاب میں مبتلا ہو اس میں اسلامی نظام کے قیام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن کا آغاز ہی ربوبیت کے تذکرہ سے ہوتا ہے اور خدا کی یہی صفت، اس کے نظام کا نقطۂ آغاز ہے۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ O

☆☆☆

نوٹ: رپورٹ کا نام ہے:

An Agenda for Islamic Economic Reform.

شائع کردہ:

Pakistan Institute of Development Economics, Islamabad.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ضرورت رشتہ

ایک بیٹی عمر ساڑھے 24 سال، ایم۔ایس۔سی (انگلش لنگوئسٹک)، ایم۔اے۔ انگلش لٹریچر (جاری)، بی۔ایڈ (جاری) کے لئے قرآنی گھرانے سے رشتہ درکار ہے۔ خواہش مند حضرات مندرجہ ذیل نمبرز پر رابطہ کریں۔

موبائل: 0334-7284755, 0333-4517888

ضرورت رشتہ

بیٹی جس کی عمر 25 سال ہے۔ امریکہ میں ڈینٹل کالج کی تیسرے سال کی طالبہ ہے۔ قد 5 فٹ 6 انچ ہے اور قرآنی فکر کی حامل امریکن نیشنل ہے، کے لئے طلوع اسلام کی تعلیمات سے مُزین، تعلیم یافتہ نوجوان لڑکے کا رشتہ درکار ہے جس کی عمر 28 تا 33 سال ہو اور امریکہ منتقل ہونے کے لئے تیار ہو۔ خواہش مند حضرات مندرجہ ذیل نمبر پر رابطہ فرما سکتے ہیں۔

Contact Phone: 001-618-204-9047, Time Difference is 12 Hours

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
azureabbas@hotmail.com
www.azharabbas.com

اسلامی مملکت میں قانون کا سرچشمہ صرف قرآن ہوتا ہے

قرآنی مملکت کا کونسٹیٹیوشن، صرف قرآن کریم ہوتا ہے، اس قرآنی مملکت میں قرآن کے علاوہ دوسرا کونسٹیٹیوشن بنانا قطعاً ناجائز ہوتا ہے۔ ارشاد عالی ہوتا ہے: إِنَّ الَّذِیْ فَرَضَ عَلَیْکَ الْقُرْآنَ (28:85)- (اے رسول، خدا نے تم پر قرآن فرض کیا ہے)۔ یعنی رسول اللہ ﷺ اور آپ ﷺ کی معرفت تمام مسلمانوں پر اس قرآن کو تمام مخلوق تک پہنچانے، اس کی تعلیم دینے اور اس کے مطابق دنیا کی اصلاح کرنے کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں پر اس کی اطاعت فرض کی گئی ہے جو قوم قرآن کو اپنا کونسٹیٹیوشن نہیں بناتی اور اس کے مطابق فیصلے نہیں کرتی وہ قوم کافر، فاسق اور ظالم قوم ہے۔ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44,46-47)- ان تینوں آیات کا تعلق اس قوم سے ہے جو قرآن کو اپنا کونسٹیٹیوشن نہیں بناتی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ وہ کافر ہیں، دوسری بات یہ کہ وہ ظالم ہیں اور تیسری بات یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ ان آیات سے بخوبی یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ جو قوم قرآن کو اپنا کونسٹیٹیوشن نہیں بناتی وہ دراصل ان تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتی ہے۔ قرآن کو اپنا کونسٹیٹیوشن تسلیم نہ کرنے کا عملی مفہوم احکامات خداوندی سے انکار کرنا ہے اور یہ کفر ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس قوم کا یہ عمل عدل و انصاف کے خلاف ہے کیونکہ قرآن کے مطابق عدل صرف قرآنی قوانین کے ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے۔ انسانوں کے وضع کردہ قوانین پر عمل کرنے سے عدل حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس لئے جب اس قوم نے خدا کے حکم کو نظرانداز کر کے فیصلے کئے تو یقیناً اس قوم نے ظلم کیا ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ جب کسی قوم نے اللہ کے قانون سے انحراف کر کے، اپنا الگ کونسٹیٹیوشن بنایا تو اس قوم نے اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی حدود سے تجاوز کیا اور یہی فسق ہے۔

حضور ﷺ نے مدینہ منورہ میں اسلامی مملکت کی داغ بیل ڈالی اور یہ مملکت حضور ﷺ کے سامنے ہی دس لاکھ مربع میل پر وسیع ہوگئی تھی۔ حضور ﷺ اس کے اولین سربراہ تھے اس لئے آپ کو یہ حکم ہوا کہ آپ خود بھی اس مملکت کے دستور (کونسٹیٹیوشن) کا اتباع کریں (6:106), (10:109), (33:2) اور اس کے مطابق فیصلے کریں: فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَآ

اَنْزَلَ اللّٰہُ (5:48)- (جو اللہ نے نازل کیا ہے اس کے مطابق فیصلے کرو)۔ ظاہر ہے کہ جن قوانین کی اطاعت کی جاتی ہے اور جس کے مطابق فیصلے کئے جاتے ہیں' وہ ہی اس مملکت کا کونسٹیٹیوشن ہوتا ہے۔ حضورﷺ نے اپنی حیات مبارکہ میں تمام فیصلے قرآن کے مطابق کئے اور صرف قرآن ہی ان کے لئے حجت اور قانون کا ماخذ تھا۔ اس لئے تمام مسلمانوں پر فرض تھا اور اب بھی فرض ہے کہ وہ صرف قرآن کے مطابق فیصلے کرائیں۔ حضورﷺ کی حیات مبارکہ میں بھی سب مسلمانوں پر فرض تھا کہ وہ صرف حضورﷺ سے فیصلے کرائیں' اور جب آپ کوئی فیصلہ کر دیں تو اس فیصلہ سے کسی قسم کی کبیدگی خاطر محسوس نہ کریں بلکہ انشراح صدر کے ساتھ اس کو قبول کر لیں: فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُونَ حَتّٰى يُحَكِّمُوكَ فِيمَا شَجَرَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوا فِي أَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوا تَسْلِيمًا (4:65)- (تمہارے پروردگار کی قسم یہ لوگ سچے مومن نہیں ہوں گے تاوقتیکہ اپنے باہمی جھگڑوں میں تم کو اپنا حاکم نہ بنائیں' پھر جو کوئی فیصلہ کرو اس سے کسی طرح دل تنگ بھی نہ ہوں' بلکہ خوشی خوشی اس کو مان لیں)۔ اس آیت کا حکم صرف حضورﷺ کی زندگی تک محدود نہیں تھا بلکہ اس آیت کا اطلاق قیامت تک کے لئے فرض ہے۔ حضورﷺ کے اپنے زمانہ میں' آپ کے فیصلوں کی اطاعت' عبادت خداوندی تھی اور حضورﷺ کے بعد اسلامی مملکت کا سربراہ جو حضورﷺ کا ہی جانشین ہوتا ہے' اس کے فیصلوں کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ مسلمانوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ: اِنَّمَا كَانَ قَوْلَ الْمُؤْمِنِينَ اِذَا دُعُوٓا اِلَى اللّٰهِ وَرَسُولِهٖ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ اَنْ يَّقُولُوا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ (24:51)- (ایمان والوں کا تو یہ کام ہوتا ہے کہ جب وہ اللہ اور رسول کی طرف بلائے جائیں تاکہ رسول ان کے تنازعات کا فیصلہ کر دے' تو وہ کہیں کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں)۔ قرآنی احکام پر عمل کرنا مومن ہونے کا ثبوت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ مومن وہ ہے کہ جب ان کو بلایا جائے کہ اس نظام کی طرف آؤ تاکہ تمہارے معاملات کے فیصلے اس نظام کے ذریعہ کئے جائیں تو وہ سمعنا و اطعنا کہتے ہیں' اور اس نظام کے سامنے سر تسلیم خم کر دیتے ہیں۔ اس کے برعکس ہم آج کے مسلمان ہیں' خواہ وہ پاکستان میں ہوں یا پاکستان کے باہر کسی اسلامی ملک میں' ہم ساری ساری رات قرآن سنتے ہیں۔ نہایت خلوص سے تراویح پڑھتے ہیں لیکن اپنے سیاسی اور معاشی امور کے فیصلے انسانوں کے وضع کردہ قوانین کی رُو سے کراتے ہیں۔

سورہ شوریٰ میں ارشاد ہوتا ہے: شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّينِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوحًا وَّالَّذِيٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيمَ وَمُوسٰى وَعِيسٰٓى اَنْ اَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ ؕ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِينَ مَا تَدْعُوهُمْ اِلَيْهِ (42:13)- (تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس پر چلنے کا نوحؑ کو حکم دیا تھا اور اے رسول اسی کی ہم نے تمہارے پاس وحی

کی ہے اور اسی کا ابراہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی حکم دیا تھا کہ دین کو قائم رکھنا اور اس میں تفرقہ نہیں ڈالنا' جس دین کی طرف تم مشرکوں کو بلاتے ہو وہ ان پر بہت شاق گذرتا ہے)۔

یہ آیہ کریمہ قرآن کریم کی نہایت اہم ترین آیات میں سے ایک آیت ہے۔ اس آیت سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ دین کا قائم کرنا ہر نبی پر فرض تھا' انبیاء کرامؑ کی بعثت کی غرض ہی یہ ہوتی تھی کہ وہ دین کو قائم کریں۔ چنانچہ اس آیت میں چند انبیاء کا ذکر نام بنام کیا ہے کہ ہر شخص کو اقامت دین کی اہمیت کا خوب اچھی طرح احساس ہو جائے۔ اسی لئے اقامتِ دین تمام فقہائے اسلام اور علماء کرام کے نزدیک مسلمہ اور متفقہ فریضہ رہا ہے۔ اس مسئلہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے' بلکہ اس مسئلہ میں اختلاف کرنا حرام ہے چونکہ ہم انبیاء کرامؑ اور کتاب خداوندی کے وارث ہیں۔ اس لئے اقامت دین ہم پر بھی اسی طرح فرض ہے جس طرح کہ یہ تمام انبیاء کرامؑ کے لئے فرض تھی۔

اس آیت میں انبیاء کرامؑ کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ پہلے ابتدائی اور آخری شخصیات یعنی نوحؑ اور رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر درمیان کے انبیاء کرامؑ میں سے تین اولوالعزم نبیوں' حضرت ابراہیمؑ' حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان انبیائے کرامؑ کا اس قدر اہتمام سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان تینوں نبیوں کے متبعین ہی اس وقت قرآن کے مخاطب تھے' مشرکین عرب حضرت ابراہیمؑ کے اتباع کے مدعی تھے اور یہود و نصاریٰ حضرت موسیٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ کے پیرو تھے۔ آیت کا یہ طرز تخاطب اس وجہ سے ہے کہ اقامتِ دین کی فرضیت کو مزید اجاگر کر دیا جائے۔

اس آیہ کریمہ کے مطابق تمام انبیاء کرامؑ اور ان سب کی امتوں کو مشترک حکم یہ ہے کہ: **أَقِيمُوا الدِّينَ وَلَا تَتَفَرَّقُوا فِيهِ** (42:13)- (دین قائم کرو اور اس میں فرقہ بندی نہ کرو)۔ جب ہم اس آیت پر غور کرتے ہیں تو تین نکات ابھر کر ہمارے سامنے آتے ہیں۔ پہلی بات تو یہ کہ دین سے کیا مراد ہے' دوسری بات یہ کہ دین کے قائم کرنے کا کیا مطلب ہے اور تیسری بات یہ کہ دین کے قیام سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

اب ان تینوں نکات کی وضاحت پیش خدمت عالی کی جاتی ہے۔

قرآن کریم نے شخصیات کا دور ختم کر کے' انسانیت کو نظام کے دور سے آشنا کیا۔ اس کے نزدیک انسان کی حکومت انسان پر بالکل حرام ہے اور ایک انسان کا دوسرے انسانوں پر حکومت کرنا' وجۂ تذلیل انسانیت ہے۔ یہ نظام سب سے پہلے حضور ﷺ نے مدینہ میں قائم فرمایا۔ جو نظام حضور ﷺ نے قائم فرمایا تھا یہ ہی دین خداوندی تھا اور اسی نظام کو قائم کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ اب آپ ان آیات کو ملاحظہ فرمائیں جن آیات میں دین بمعنی نظام استعمال کیا گیا ہے۔

(1) اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ (12:40)-

حکومت تو بس خدا کے لئے ہی ہے' اس نے تو حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو' یہی سیدھا دین ہے۔

(2) وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ (40:26)-

فرعون نے کہا' چھوڑو مجھے میں موسیٰ کو قتل ہی کر دیتا ہوں اور اب وہ اپنے رب کو پکارے مجھے خوف ہے کہ یہ کہیں تمہارا دین نہ بدل دے یا ملک میں فساد نہ پھیلا دے۔

قصہ موسیٰ و فرعون کو پڑھنے سے یہ اچھی طرح معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں دین سے مراد پرستش وغیرہ نہیں ہے۔ بلکہ یہاں دین نظام' یا مملکت کے معنوں میں آیا ہے۔ فرعون کو اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر حضرت موسیٰ نے قوت حاصل کر لی' تو وہ اس کا نظام بدل کر رکھ دیں گے۔

(3) اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ (3:19)-

اور اللہ کے نزدیک تو نظام بس اسلام کا نظام ہے۔

(4) وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ (3:85)-

اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کی خواہش کرے' تو اس کا وہ دین ہرگز قبول ہی نہ کیا جائے گا۔

(5) اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ ۖ وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (24:2)-

زانی مرد اور زانی عورت دونوں کو سو سو کوڑے مارو اور اللہ کے دین (قانون) کے معاملہ میں ان پر رحم نہ کرو۔

(6) مَا كَانَ لِيَاْخُذَ اَخَاهُ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ (12:76)-

یوسف اپنے بھائی کو بادشاہ کے دین میں پکڑنے کا مجاز نہیں تھا۔

اس سے واضح ہے کہ کسی مملکت کا فوجداری قانون بھی دین ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ فوجداری قانون کی اطاعت کرتا ہے' تو وہ خدا کے دین کا متبع ہے اور اگر کوئی بادشاہ کے قانون پر چلتا ہے' تو وہ بادشاہ کے دین کا متبع ہے۔

(7) سورہ توبہ میں: وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ (9:29)-

وہ نظام خداوندی کی اطاعت اختیار نہیں کرتے' آیا ہے۔

(8) سورہ واقعہ میں ارشاد ہے: غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ (56:86)-

یعنی وہ جو کسی کے ماتحت نہ ہوں۔

(9) هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (48:28)-

وہ ہی تو ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر بھیجا تا کہ اس کو تمام دینوں پر غالب رکھے۔

ان مندرجہ بالا آیات کریمات نے دین کی وضاحت کر دی کہ دین صرف پرستش کی چند رسومات میں ہی محدود نہیں ہوتا بلکہ دین ایک ضابطۂ حیات ہوتا ہے اور حضورﷺ نے اپنے دور میں قرآن کریم کے عطا کردہ دین کو ہی قائم فرمایا تھا۔

ہم مسلمان دین اور مذہب میں کوئی تفریق نہیں کرتے اور مذہب کو ہی دین سمجھتے ہیں' ہم نے اسلام کو دین کی بجائے مذہب کی حیثیت سے اختیار کیا ہوا ہے اور یہی ہمارے زوال اور ہماری تباہی کا اصل سبب ہے۔ خلافت راشدہ کے بعد سے ہمارے میں مذہب ہی رائج ہے۔ دین کا کوئی تصور نہیں ہے ہم نے پرستش کرنے کی صرف چند رسومات اپنائی ہوئی ہیں اور انہیں ہی انجام دے کر ہم سمجھتے ہیں کہ ہم نے اسلام کے تمام مطالبات پورے کر دیئے ہیں جبکہ اقامتِ دین سے مراد ہوتی ہے کہ قرآن کریم کے عطا کردہ نظام ربوبیت کو عملاً رائج و نافذ کیا جائے۔ جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ کسی شخص نے یا کسی سیاسی پارٹی نے اپنی حکومت قائم کر لی ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ کوئی شخص یا کوئی سیاسی پارٹی' اپنی حکومت قائم کرنے کی دعوت دے رہی ہے بلکہ اس کے یہ معنے ہوتے ہیں کہ اس شخص یا اس پارٹی کے احکامات عملاً اس ملک میں جاری ہو رہے ہیں۔ جب کسی ملک کا حوالہ دیا جائے کہ فلاں ملک میں کمیونزم کا نظام جاری ہے تو اس کے واضح معنے یہ ہوتے ہیں کہ اس ملک میں کمیونزم کے قوانین جاری ہیں اور وہاں کی عدالتیں کمیونزم کے نظام کے مطابق فیصلے کر رہی ہیں' ان مثالوں کو پیش نظر رکھنے کے بعد یہ نتیجہ نکالنے میں کوئی دشواری نہ ہونی چاہئے کہ جب انبیاء کرامؑ کو دین قائم کرنے اور اس کو قائم رکھنے کا حکم دیا گیا تھا تو اس سے مراد صرف یہ نہیں تھی کہ وہ خود دین پر عمل کر لیں' یا اپنے دین کی تبلیغ اپنے ملک میں کر لیں' بلکہ اس سے یہ مراد ہوتی تھی کہ وہ اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ اور تجویز کردہ پورے کا پورا دین' بطور ضابطۂ حیات کے جاری کر دیں اور اس کا عملی ثبوت حضورﷺ کی زندگی ہے کہ انہوں نے رات دن کی محنتِ شاقہ کے بعد دین کو اپنی زندگی میں قائم کر کے دکھا دیا' اور ان کا یہی وہ اسوہ حسنہ ہے جو ہم سب مسلمانوں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔

تیسری بات قابل غور یہ ہے کہ اقامتِ دین سے کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں' تو اس بارے میں عرض ہے کہ اقامتِ دین کا سب سے پہلا فائدہ تو یہ ہوتا ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کی محکومیت سے آزاد ہو جاتا ہے' کیونکہ دین میں کسی شخص کی اطاعت نہیں ہوتی' اس میں کسی شخص کو قانون سازی کا اختیار ہی نہیں ہوتا' اطاعت صرف اس نظام کی ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہوتا ہے جو حضرات اس نظام کو رواں دواں رکھتے ہیں' ان پر یہ فرض ہوتا ہے کہ سب سے پہلے وہ خود اس نظام کی اطاعت کریں' اور اس کے بعد وہ دوسروں سے اس کی اطاعت کرائیں۔ سربراہ مملکت سب سے زیادہ اس نظام کی اطاعت کرتا ہے (6:163)- سربراہِ مملکت کو نہ صرف یہ کہ کسی قسم کی حفاظت (Immunity) حاصل نہیں ہوتی بلکہ یہ کہ: عَلَيْهِ مَا حُمِّلَ وَعَلَيْكُمْ مَّا حُمِّلْتُمْ (24:54)- (جس طرح تمہارے فرائض ہیں' اسی طرح رسول کو بھی اپنے فرائض ادا کرنے ہوتے ہیں)۔ ازواج رسول ﷺ کے لئے حکم تھا کہ ازواج رسول ﷺ میں سے اگر کسی سے غلطی سرزد ہو جائے' تو انہیں عام خواتین سے دوگنی سزا دی جائے گی۔ حضرت عمرؓ کا دستور تھا کہ ''جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے' ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو لوگ تمہاری طرف اسی طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے' اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دگنی سزا دوں گا' اب تمہیں اختیار ہے' جو چاہے حدود سے تجاوز کرے' جو چاہے ان کے اندر رہے۔'' اسلامی مملکت کا سربراہ نہ تو کسی کی سفارش کر سکتا ہے اور نہ کسی کے جرم کو معاف کر سکتا ہے' ہر شخص خود اپنے کئے کا ذمہ دار ہوتا ہے (35:18)-

(2) اسلامی مملکت کی اساس مشورہ پر ہوتی ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38)- ان کے سب کام آپس کے مشورے سے ہوتے ہیں۔ حضور ﷺ کو خود کو بھی حکم تھا کہ: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (3:159)- (ان سے کام میں مشورہ کر لیا کرو)۔ قرآن کریم کی حدود کے اندر اندر امت مسلمہ مکمل طور پر آزاد ہی ہوتی ہے کہ اپنے قوانین زمانہ کے تقاضوں کے مطابق خود وضع کرتے چلیں اور ان میں زمانہ کے تقاضوں کے مطابق تبدیلی کرتے چلے جائیں' قرآن کریم' ہر وقت بحیثیت کونسٹیٹیوشن کے نگاہوں کے سامنے ہوتا ہے۔ اس کو اساسی دستور قرار دے کر' اسمبلی By Laws بناتی چلی جاتی ہے' قرآن کریم میں دیوانی اور فوجداری (Criminal, Civil) دونوں قوانین موجود ہیں' نیز یہ کہ اسلامی مملکت میں شرعی عدالتیں الگ نہیں ہوتیں۔ اس مملکت کی تمام عدالتیں شرعی عدالتیں ہوتی ہیں۔

(3) اسلامی نظام کے قیام سے اللہ تعالیٰ کے وہ وعدے پورے ہوتے ہیں جو اس نے انسانیت سے کئے ہوئے ہیں۔ اللہ تعالیٰ، بزرگ و برتر کا وعدہ ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6)- اور زمین کے ہر جاندار کا رزق اللہ کے ذمہ ہے، حواشی عثمانی میں تحریر ہے: ''یعنی زمین پر ہر چلنے والا جاندار جسے رزق کی احتیاج لاحق ہوتی ہو، اس کو روزی پہنچانا خدا نے محض اپنے فضل سے اپنے ذمہ لازم کرلیا ہے، جس قدر روزی جس کے لئے مقدر ہے یقیناً پہنچ کر رہے گی۔'' اس آیۂ کریمہ کے مطابق اللہ تعالیٰ نے رزق پہنچانے کی ذمہ داری لے رکھی ہے، لیکن ہمارا شب و روز کا مشاہدہ یہ ہے کہ ایسے لوگ بھی موجود ہیں جن کو رزق نہیں ملتا اور وہ رات کو بھوکے سو جاتے ہیں، یعنی ہمارا روزانہ کا مشاہدہ اس آیت کے خلاف جاتا ہے، ہمارے علمائے کرام کے پاس اس کا قطعاً کوئی جواب نہیں ہے، اس اعتراض کا جواب دیتے ہوئے حضرت اقدس تحریر فرماتے ہیں: ''البتہ خدا کی قدرت کو ان اسباب عادیہ میں محصور و مقید نہ سمجھا جائے وہ گاہ بگاہ سلسلۂ اسباب کو چھوڑ کر بھی روزی پہنچا تا یا کوئی اور کام کر دیتا ہے''۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ (36:47) کے مطابق اللہ تعالیٰ کے یہ وعدے اس کے نظام کے ذریعے پورے ہوتے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ کا وعدہ کہ: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا (4:141)- اور خدا نے کافروں کو مومنین پر غالب رہنے کی کوئی راہ نہیں دی۔ پھر ارشاد عالی ہوتا ہے: وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (3:139)- اگر تم سچے مومن ہو تو تم ہی غالب آؤ گے۔ مسلمانوں کو غلبہ و اقتدار حاصل ہونے کا وعدہ اس کے نظام کے ذریعے پورا ہوتا ہے۔ دعائیں بھی صرف نظام کے ذریعے پوری ہوتی ہیں (2:186)- اللہ تعالیٰ سے اپنی لغزشوں کی مغفرت بھی نظام کے ذریعے حاصل ہوتی ہے (4:64)- انسانوں کا اللہ تعالیٰ سے رابطہ صرف نظام کے ذریعے قائم رہتا ہے اور سب سے بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ نظام کی معرفت ہی اللہ تعالیٰ کی عبادت ہو سکتی ہے، اگر نظام قائم نہیں ہوتا تو انسانیت عبادت خداوندی سے محروم ہوتی ہے۔

(4) اسلامی نظام میں انسانوں کی صلاحیتیں اپنی پوری نشو و نما کو پہنچتی ہیں۔ حضور ﷺ کے ذمہ تھا کہ آپ ﷺ انسانیت کے ہر فرد کی نشو و نما کریں: يزكيهم (3:164) ,(62:2)- اقامتِ دین سے مراد ہی ایک ایسا معاشرہ قائم کرنا ہوتا ہے جس میں تمام افراد قوانین خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں، اس میں ہر فرد دوسرے افراد کی نشو و نما کا سامان بہم پہنچاتا ہے۔ ہمارے معاشروں میں معاشی طبقات کی تقسیم ملک کی بہت بڑی آبادی کو بے سہارا چھوڑ دیتی ہے، انہیں نہ تو تعلیم ملتی ہے اور نہ ہی ان کو کوئی اچھی تربیت ہوتی ہے۔ تعلیم حاصل کئے بغیر انسانی صلاحیتیں برومند ہو ہی نہیں سکتیں۔ انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما

نہ ہونے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارا یہ غلط عقیدہ ہے کہ تزکیہ نفس پرستش کے ذریعے ہوتا ہے' ہمارا سارا مذہبی طبقہ تزکیہ نفس پرستش کے ذریعہ کرتا ہے' جبکہ قرآن کی رو سے تزکیہ نفس' یعنی انسانی صلاحیتوں کی نشوونما صرف اسلامی مملکت میں ممکن ہوسکتی ہے' قرآن کریم کی مستقل اقدار پر عمل کرنے سے تزکیہ نفس ہوتا ہے' قرآن کریم کے نزدیک تزکیہ نفس کے معنے روحانی ترقی نہیں ہے بلکہ قرآن کے نزدیک تزکیہ نفس کے معنے انسانوں کی صلاحیتوں کی نشوونما ہوتا ہے اور یہ مستقل اقدار کے ذریعے صرف اسلامی نظام میں تکمیل پاتی ہیں۔

یہ بات بھی واضح رہے کہ اسلامی مملکت تھیوکریسی نہیں ہوتی۔ تھیوکریسی میں علماء کی حکومت ہوتی ہے' اس میں قانون کا ماخذ ومصدر' قرآن' حدیث' اجماع اور قیاس ہوتے ہیں اور اس میں زمام اقتدار علماء کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور وہ علماء' اس مملکت میں وہ قانون جاری کرتے ہیں جن کی بنیاد فرقہ پرستی پر ہوتی ہے۔ وہ ایک ہزار سال پیشتر کے وضع کردہ ہوتے ہیں اور وہ قوانین گذشتہ فقہا کی ذاتی آراء پر مبنی ہوتے ہیں۔ جبکہ اسلامی نظام میں کسی کی حکومت نہیں ہوتی۔ اقتدار پوری قوم کو حاصل ہوتا ہے (24:55) آپس کی مشاورت سے زمانہ کے تقاضوں کے مطابق' قرآنِ کریم کی حدود کے اندر' روزانہ' جدید سے جدید ترین قوانین وضع کئے جاتے ہیں' اس مملکت میں مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیوں کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی' اس میں صرف مشاورت ہوتی ہے۔ قرآن کریم نے مشاورت کا کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا' مشاورت کا طریقہ بھی حالات کے مطابق بدلتا رہے گا۔

اسلامی مملکت میں اقتدار اعلیٰ صرف خدا کو حاصل ہوتا ہے۔ اور کسی کا کوئی حصہ اس اقتدار اعلیٰ میں نہیں ہوتا (6:57, 18:26) خدا چونکہ سامنے نہیں آسکتا اور براہِ راست احکامات جاری نہیں کرتا' اس لئے اس کے اقتدار کی عملی شکل اس کی کتاب کی حکمرانی ہوتی ہے: اِتَّبِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ (7:3)- جو کچھ تمہارے رب نے تمہاری طرف نازل کیا ہے اس کا اتباع کرو اس کے علاوہ دوسرے کارفرماؤں کا اتباع نہ کرو۔ یعنی خدا کا یہ اقتدار اعلیٰ اس کی کتاب کی رو سے نافذ العمل ہوتا ہے' اس حقیقت کو دوسرے مقام پر اس طرح ارشاد فرمایا ہے: اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَآ اَرٰىكَ اللّٰهُ (4:105)- بے شک ہم نے تیری طرف یہ کتاب حق کے ساتھ نازل کی تاکہ تو لوگوں کے درمیان اس کے مطابق حکومت قائم کرے جس کا اللہ نے تجھے علم دیا۔

اسلامی مملکت کا ایک خصوصی امتیاز یہ بھی ہے کہ اس حکومت میں مملکت اور عوام کے مفادات ایک ہوتے ہیں۔

دونوں کا مقصد اور ہدف اطاعتِ خداوندی ہوتا ہے۔ مفادات کے اشتراک کی وجہ سے اس مملکت میں جرائم کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی ہے۔ مملکت کا ہر فرد مملکت کی اطاعت اس وجہ سے کرتا ہے کہ اس کی اطاعت سے عبادت خداوندی ہوتی ہے۔

وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العالمین

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	160/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	325/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ النمل	(27)	280	225/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	350/-	سورہ القصص	(28)	334	250/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	350/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	275/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	350/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	325/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	325/-
سورہ النحل	(16)	334	250/-	سورہ یٰسین	(36)	164	125/-
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	275/-	سورہ الصٰفٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	325/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	325/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	275/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	325/-
سورۃ الانبیآء	(21)	336	225/-				
سورۃ الحج	(22)	380	275/-				
سورۃ المؤمنون	(23)	408	300/-				
سورۃ النور	(24)	264	200/-				
سورۃ الفرقان	(25)	389	275/-				

ملنے کا پتہ: ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ) 25/B، گلبرگ 2، لاہور، فون نمبر: 4546 3571-42-92+

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویزؒ

روزوں کا مقصود و منتہیٰ

(پرویزؒ صاحب کا ایک درسِ قرآنِ مجید)

عزیزانِ گرامی قدر! درسِ قرآن کے سلسلہ کے اعتبار سے آج سورۃ النمل کی اگلی آیت سے سلسلۂ کلام شروع ہونا چاہئے تھا لیکن احباب کے تقاضا کے پیشِ نظر آج کا درس روزہ کے موضوع کے لئے مختص کیا جا رہا ہے۔ میں اس درس میں روزوں کے مسائل کے متعلق بات نہیں کروں گا۔ یہ احکام سورۂ بقرہ کی تین چار آیات (۱۸۳۔۲/۱۸۷) میں نہایت جامعیت سے بیان ہوئے ہیں؛ اس لئے ان کے دہرانے کی ضرورت نہیں۔ ان کے بجائے میں اس امر کی وضاحت کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن کریم کی رو سے روزوں کا مقصد کیا ہے؟ ان کی غایت کیا ہے؟ یہ کیوں فرض قرار دیئے گئے ہیں؟

قرآنِ کریم کی ایک خصوصیت (بلکہ جہاں تک میری نگاہ کام کرتی ہے اس کی انفرادیت) یہ بھی ہے کہ یہ جب کوئی حکم دیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی وضاحت بھی کر دیتا ہے کہ یہ حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس پر عمل پیرا ہونے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ مثلاً اس قسم کی آیات آپ کو کئی ایک مقامات پر ملیں گی:

انزل اللہ علیک الکتٰب والحکمۃ. (۴/۱۱۳).

''اے رسولؐ! اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت نازل کی ہے''۔

کتاب کے معنیٰ احکام یا قوانین کے ہیں اور حکمت سے مراد ان احکام و قوانین کی غرض و غایت۔ یہ دونوں منزل من اللہ ہیں۔ احکام کے سلسلے میں یہ انداز، عظیم حکمتِ بالغہ پر مبنی ہے۔ اگر کسی کو کوئی حکم دیا جائے لیکن اس کی غرض و غایت نہ بتائی جائے۔ یعنی اسے یہ نہ بتایا جائے کہ اسے وہ حکم کیوں دیا جا رہا ہے تو وہ اس کی تعمیل طوعاً و کرہاً کرے گا' بطیّب خاطر نہیں کرے گا۔ مستبد حکومتیں اسی طرح احکام صادر اور نافذ کرتی ہیں۔ لوگ ان پر بامرِ مجبوری عمل پیرا ہوتے ہیں اور اسی لئے ان سے گریز کی راہیں تراشتے اور فرار کے طریقے سوچتے رہتے ہیں۔ اگر انہیں بتا دیا جائے کہ ان احکام کی اطاعت سے انہیں کیا حاصل ہوگا۔ اس میں خود ان کے کیا کیا فوائد مضمر ہیں تو وہ ان پر دل و دماغ کی کامل رضامندی سے عمل پیرا ہوں گے اور ان سے منحرف ہونے کا خیال تک بھی دل میں نہ لائیں گے۔ کتاب کے ساتھ

حکمت کی وضاحت کی پہلی مصلحت یہ ہے۔

دوسرے یہ کہ جب آپ کو بتا دیا جائے کہ اس حکم کی تعمیل کا نتیجہ یہ ہوگا تو آپ قدم قدم پر اس کا جائزہ لیتے جائیں گے کہ اس حکم کی صحیح معنوں میں تعمیل ہو رہی ہے یا نہیں۔ اگر اس حکم کی غایت نہ بتائی جائے تو آپ اس پر بلا سوچے سمجھے مکینکی طور پر عمل کرتے رہیں گے اور کبھی یہ نہیں دیکھ سکیں گے کہ اس حکم کی تعمیل صحیح طور پر ہو رہی ہے یا نہیں۔ اور اگر آپ نے اپنے ذہن میں فرض کر لیا کہ اس کا نتیجہ یہ برآمد ہوگا تو آپ بڑی غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور ہو سکتا ہے کہ آپ کی ساری محنت رائیگاں چلی جائے۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ڈاکٹر مریض کے لئے ایک دوائی تجویز کرتا ہے اور کہتا ہے کہ دوائی دینے کے بعد مریض کا ٹمپریچر لیتے جائیں۔ ہر گھنٹے کے بعد کم از کم ایک ڈگری بخار کم ہو جائے گا۔ آپ مریض کو دوا پلاتے ہیں اور ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق اس کا ٹمپریچر لیتے ہیں۔ اگر بخار کم ہو رہا ہے تو آپ کو اطمینان ہوگا اور آپ علاج جاری رکھیں گے لیکن اگر آپ دیکھیں کہ بخار کم نہیں ہو رہا تو آپ کو از سرِ نو جائزہ لینا ہوگا کہ یا تو مرض کی تشخیص صحیح نہیں ہوئی یا دوائی ٹھیک نہیں ملی اور یا اس کی استعمال میں آپ سے کوئی غلطی ہوئی ہے۔ یہ نہیں ہوگا کہ ڈاکٹر کے کہنے کے مطابق نتیجہ برآمد نہ ہو اور آپ بدستور وہی دوائی دیتے چلے جائیں۔ اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس کا جو نتیجہ نکل سکتا ہے ظاہر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاں کوئی حکم دیا ہے اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا ہے کہ اس پر عمل پیرا ہونے سے نتیجہ کیا نکلے گا۔ اگر اس کا وہ نتیجہ برآمد نہیں ہوتا تو آپ کو رک کر سوچنا ہوگا کہ اس حکم کی تعمیل میں آپ سے کیا غلطی ہو گئی ہے۔ اس سے نہ صرف یہ کہ آپ کی محنت رائیگاں نہیں جائے گی بلکہ اس حکم کی غلط تعمیل کے نقصانات سے بھی آپ محفوظ رہیں گے۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ **کتب علیکم الصیام** (۲/۱۸۳). ''اے جماعتِ مومنین! تم پر صیام فرض قرار دیئے گئے ہیں''۔ یہ ''کتاب'' یعنی حکم ہے۔ اس کی غایات کے متعلق کہا:

لعلکم تتقون (۲/۱۸۳). **لعلکم تشکرون** (۲/۱۸۵) اور **ولتکبرو اللہ علی ماھدٰکم**. (۲/۱۸۵).

تتقون سے مراد یہ ہے کہ تم میں قوانینِ خداوندی کی اطاعت کے لئے پختگی پیدا ہو جائے اور تم غلط راہوں پر چلنے کے نقصانات سے محفوظ ہو جاؤ۔ **تشکرون**' سے مقصود یہ ہے کہ تمہاری محنتیں بھرپور نتائج پیدا کر دیں۔ میں ان دو غایات کے متعلق سرِ دست تفصیل میں نہیں جاؤں گا۔ قرآن کریم نے جو غایت الغایات بتائی ہے اس پر مرکوز رہوں گا اور وہ غایۃ الغایات یہ ہے کہ تم خدا کے بتائے ہوئے پروگرام پر عمل کرنے سے اس قابل ہو جاؤ گے کہ دنیا میں خدا کی کبریائی قائم کر سکو۔ یہ ہے روزوں کے متعلق حکم خداوندی کا مقصود و منتہیٰ۔ یعنی خدا کی کبریائی قائم کرنے کے قابل ہو جانا:

لتکبرو اللہ علی ما ھدٰکم

سب سے پہلے لفظ ''کبریائی'' کو لیجئے۔اس کے معنی حکومت اور اقتدار کے ہیں۔سورہ یونس میں ہے کہ جب حضرت موسیٰؑ اوران کے بھائی حضرت ہارونؑ فرعون کے پاس گئے اوراس تک خدا کا پیغام پہنچایا تو اہلِ فرعون نے کہا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو ہم اس کی غرض وغایت کو خوب پہچانتے ہیں۔یعنی یہ کہ **تکون لکما الکبریاء فی الارض** (۱۰/۷۸) ''تمہارا مقصد یہ ہے کہ اس ملک میں حکومت تمہاری قائم ہوجائے۔اقتدار تمہارے ہاتھ میں آجائے''۔اس سے لفظ ''کبریائی'' کا مفہوم واضح ہوجاتا ہے۔

جہاں تک خارجی کائنات کا تعلق ہے اس میں خدا کا اقتدار اوراس کی حکمرانی براہِ راست قائم ہے۔تمام کارگہ کائنات اسی کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے اوراس میں کسی شے کو مجالِ انحراف نہیں یارائے سرکشی نہیں:**ولہ الکبریاء فی السمٰوٰت والارض و ھو العزیز الحکیم** (۴۵/۳۷). ''کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں کبریائی خدا کی ہے۔وہ زبردست غلبہ کا مالک ہے لیکن اس کا غلبہ مستبد حکمرانوں کا غلبہ نہیں۔وہ سراسر حکمت پر مبنی ہے۔'' دوسری جگہ ہے:**وھوا الذی فی السماء الہ و فی الارض اللہ** (۴۳/۸۴). ''وہی آسمانوں میں بھی صاحبِ اقتدار ہے اور وہی ارض پر بھی صاحبِ اقتدار۔'' (اللہ کے معنی صاحبِ اقتدار کے ہیں)۔

خارجی کائنات میں تو خدا کا اقتدار ازخود قائم ہے۔لیکن اس کی مشیت کا پروگرام یہ ہے کہ انسانوں کی دنیا میں اس کی کبریائی ازخود انسانوں کے ہاتھوں قائم ہو۔اسی مقصد کے لئے رسول بھیجے جاتے تھے اور رسول کے بعد اس کی ذمہ داری اس کی امت پر عائد ہوتی تھی۔چنانچہ جب نبی اکرم ﷺ کو منصبِ نبوت پر سرفراز فرمایا گیا تو آپ کو حکم دیا گیا کہ **یایھا المدثر**. ''اے وہ کہ جس کی آمد سے خزاں دیدہ گلشنِ کائنات بہارِ نو کا مظہر بن جائے گا۔(**المدثر** کے یہی معنی ہیں)۔**قم فانذر**۔''اٹھ اور نوع انسان کو ان کے اپنے وضع کردہ نظام ہائے حیات کی تباہ کاریوں سے آگاہ کردے''۔**وربک فکبر** (۷۴/۱.۲). ''اوران نظاموں کی جگہ اس نظام کو قائم کر جس میں کبریائی صرف خدا کے لئے ہو''۔۔۔یہ تھا منصبِ رسالت۔

دوسرے مقام پر اسی حقیقت کو جن الفاظ میں بیان کیا گیا ہے ان کی تفصیل بڑی وسعت چاہتی ہے لیکن میں ان میں سے صرف دو ٹکڑوں کو نمایاں طور پر سامنے لاؤں گا۔**ولم یکن لہ شریک فی الملک**. ''حکومت صرف اسی کے لئے مختص ہے۔اس میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہوسکتا''۔اوراس سے آگے ہے:**وکبرہ تکبیراً**. (۱۷/۱۱۱) ''لہٰذا تم اس کی کبریائی قائم کرو''۔اسی اعتبار سے خدا نے اپنے آپ کو ایک جگہ:**المتکبر** (۵۹/۲۳) کہا ہے۔کہیں **الکبیر المتعال** (۱۳/۹) اور کہیں:**العلی الکبیر**

(۲۲/۶۲). ہماری دنیا میں وہ العلی الکبیر کیسے قرار پاتا ہے اس کی وضاحت اس نے یہ کہہ کر کر دی کہ فالحکم للہ العلی الکبیر (۴۰/۱۲)، تمہاری دنیا میں حکم صرف اس خدا کا چلنا چاہئے جو ہر قسم کے غلبہ اور کبریائی کا مالک ہے۔

اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا نہ تو ہمارے سامنے آتا ہے۔ نہ وہ تختِ حکومت پر بیٹھتا ہے۔ نہ ہم اس کی آواز سنتے ہیں۔ تو ہمارے معاشرے مین اس کی حکومت کیسے قائم ہوگی؟ اس کے لئے اس نے خود ہی بتا دیا کہ۔۔۔ اس نے ہماری طرف اپنا ضابطۂ احکام بھیج دیا ہے۔ جو حکومت اس ضابطہ کے مطابق قائم ہوگی اسے خدا کی حکومت سے تعبیر کیا جائے گا۔ چنانچہ اس نے واضح الفاظ میں بتا دیا کہ

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکفرون (۵/۴۴).

جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے ان ہی کو کافر کہا جاتا ہے۔

☆☆☆

لیکن خدا کی یہ کبریائی یونہی بیٹھے بٹھائے، وعظ و نصیحت یا تقاریر و خطابات سے قائم نہیں ہو جاتی۔ جب اس کا مقصد دنیا کے ہر نظام کو الٹ کر اس کی جگہ نظامِ خداوندی کو متمکن کرنا ہے تو ظاہر ہے کہ دنیا کی ہر قوم اور ہر حکومت کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی اور ہر مفاد پرست گروہ اس کی مزاحمت کرے گا۔۔۔ ان مخالفتوں اور مزاحمتوں کے مقابلے کے لئے میدان جنگ تک میں بھی جانا پڑے گا۔ چنانچہ قرآنِ کریم میں جماعتِ مومنین کی ان جنگوں کی غایت یہ بتائی گئی ہے:

وجعل کلمۃ الذین کفروا السفلیٰ و کلمۃ اللہ ھی العلیا (۹/۴۰).

اس سے مقصد یہ ہے کہ ہر غیر خداوندی نظام مغلوب ہو جائے اور خدا کا نظام جسے غالب ہونے کا حق حاصل ہے، عملاً مسلط ہو جائے۔ اس سے چند ہی آیات پہلے کہا گیا ہے:

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ ولو کرہ المشرکون (۹/۳۳).

خدا وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ضابطۂ ہدایت اور حق پر مبنی نظام دے کر بھیجا تا کہ یہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے۔ خواہ یہ تبدیلی ان لوگوں پر گراں کیوں نہ گزرے جو خالص حکومتِ خداوندی قائم نہیں کرنا چاہتے۔

یہاں صرف اتنا کہا گیا ہے کہ اس نے رسول کو اس مقصد کے لئے بھیجا۔ لیکن دیگر مقامات پر اس کی وضاحت کر دی کہ نظامِ خداوندی کا قیام تنہا رسول کے ہاتھوں سے عمل میں نہیں آئے گا۔ اس کے لئے جماعتِ مومنین کی معاونت و رفاقت بھی ضروری ہوگی۔ یعنی یہ فریضہ

محمد رسول اللہ والذین معہ (۴۸/۲۹) کے ہاتھوں سرانجام پائے گا۔

اللہ تعالیٰ نے **الاعلیٰ** اپنے آپ کو کہا تھا لیکن جس جماعتِ مومنین کے ہاتھوں اس کی کبریائی دنیا میں قائم ہوتی ہے۔ اس نے انہیں **الاعلون** کہہ کر پکارا ہے۔ چنانچہ اس نے فرمایا: **وانتم الاعلون ان کنتم مؤمنین** (۳/۱۳۸). ''اگر تم مومن ہو اور مومن رہو گے تو دنیا میں تم ہی سب پر غالب رہو گے''۔ تمہارا قائم کردہ نظام انسانوں کے ہر خود ساختہ نظام پر غالب آ جائے گا۔ اس غلبہ و تسلط کے لئے قرآن کریم نے **ان کنتم مومنین** کی شرط عائد کر دی ہے۔ ''یعنی اگر تم مومن ہوئے تو''۔ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کیسے معلوم ہو کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟ اس کے لئے قرآن نے خود یہ واضح کر دیا کہ جو لوگ خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے وہ مومن نہیں' کافر ہیں لہٰذا مومن وہ ہیں جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم کرتے ہیں اور اس کی محسوس نشانی یہ ہے کہ وہ دنیا کی ہر قوم پر غالب رہتے ہیں۔ چنانچہ اس نے واضح طور پر کہہ دیا کہ

ولن یجعل اللہ للکٰفرین علی المومنین سبیلا (۴/۱۴۱).

خدا کبھی ایسا نہیں ہونے دے گا کہ غیر خداوندی نظام کی حامل قوم کو جماعتِ مومنین پر غالب آنے دے۔

لہٰذا یہ متعین کرنا بالکل آسان ہو گیا کہ ہم مومن ہیں یا نہیں؟

یہاں ایک عظیم نکتہ سامنے آتا ہے۔ خدا مومنین سے کہتا ہے کہ: **انتم الاعلون**۔ لیکن مومن اس کی عطا کردہ اس سرفرازی کے جذبۂ تشکر کے احساس سے بے ساختہ اپنا سر زمین پر رکھ دیتا ہے اور انتہائی انکساری اور خاکساری کے عالم میں کہتا ہے کہ **الاعلی** میں نہیں۔ **سبحن ربی الاعلی**.. **الا علی** کے شایان شان صرف تیری ذات ہے۔ یہ تو تیری عاجز نوازیاں ہیں' جو ہمیں **الاعلون** کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہ علو مرتبت ہماری ذاتی نہیں' تیری عطا فرمودہ ہے۔ اگر ہمارا سر تیرے سامنے نہیں جھکتا تو یہ ساری کبریائی جو ہمیں حاصل ہوئی ہے فرعون کی قہرمانیت ہے' مومن کی علوشان نہیں۔ اسی بنا پر قرآن کریم نے حق پر مبنی کبریائی اور باطل پر مبنی کبریائی میں فرق کر کے بتا دیا جب کہا:

ساصرف عن اٰیٰتی الذین یتکبرون فی الارض بغیر الحق (۷/۱۴۶).

جو لوگ الحق کے بغیر زمین میں غلبہ اور کبریائی حاصل کر لیتے ہیں' ہم اپنے قوانین کی رو سے انہیں اس مقام سے ہٹا دیں گے اور ان کی جگہ وہ قوم لے لے گی جس کی کبریائی الحق پر مبنی ہو گی۔

ان تصریحات سے واضح ہو گیا کہ روزوں کی غرض و غایت اور مقصود و منتہیٰ کیا تھا؟ ان کا مقصد جماعتِ مومنین کو اس کے

لئے تیار کرنا تھا کہ وہ دنیا میں خدا کی کبریائی متمکن کرسکیں۔ لتکبرو الله علی ماهدٰکم. صدرِاول کی جماعتِ مومنین تیرہ برس تک مکہ کی زندگی گذارنے کے بعد مدینہ میں آئی تاکہ یہاں کی نسبتاً مساعد فضا میں نظامِ خداوندی کی بنیاد رکھ دی جائے' لیکن مخالفین نے انہیں یہاں بھی چین سے نہ بیٹھنے دیا اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کردیں۔ یہ تھا وہ مقام جب پہلی مرتبہ (۲ھ میں) روزے فرض ہوئے اور ابھی سترہ دن کے روزے ہی رکھے گئے تھے کہ انہیں بدر کے میدان میں اترنا پڑا اور وہاں ان روزہ داروں نے خدا کی کبریائی کی پہلی اینٹ رکھ دی۔ آپ نے غور فرمایا کہ روزوں کی غایت کیا تھی؟ ۔۔۔ لتکبروا لله علی ما هدٰکم. خدا کے پروگرام کے مطابق ملک میں اس کی کبریائی قائم کرنا۔ اس زمانے میں مستقل فوج (Standing Army) ہنوز وجود میں نہیں آئی تھی۔ قرآنِ مجید نے تمام مومنین کو مجاہدین (فوج کے سپاہی) قرار دیا تھا۔ ایسا نظر آتا ہے کہ جس طرح آج کل مستقل فوج سے الگ۔۔۔ (Reservists) ہوتے ہیں۔ وہ اپنا اپنا کاروبار کرتے رہتے ہیں لیکن انہیں سال میں ایک آدھ ماہ کے لئے بلالیا جاتا ہے تاکہ وہ فوجی ٹریننگ کی تجدید کرلیں اور بوقتِ ضرورت فوج کے ہمدوش میدان جنگ میں نبردآزما ہوں۔ خدا کی کبریائی کا تمکن مومن مجاہدین کا فریضہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کا مہینہ انہیں سپاہیانہ زندگی کا خوگر بنانے کے لئے مختص کردیا گیا تھا۔ حضور نبی اکرم ﷺ سے جب سوال کیا گیا کہ مومن کی زندگی کیا ہے؟ تو فرمایا کہ جب جنگ ہو رہی ہو تو وہ میدان جنگ میں ہو اور جب جنگ نہ ہو رہی ہو تو وہ جنگ کی تیاریوں میں مصروف ہو۔

آپ نے دیکھا کہ مومن کی زندگی کا مقصود و منتہیٰ دنیا میں خدا کی کبریائی کو متمکن کرنا ہے اور یہی مقصد روزوں کا بتایا گیا ہے۔ اس کے لئے رمضان کے مہینے کی تخصیص کیوں کی گئی' اسے خود خدا نے یہ کہہ کر واضح کردیا کہ شهر رمضان الذی انزل فيه القران (۲/۱۸۵). ''رمضان کا مہینہ وہ ہے جس میں نزول قرآن کی ابتداء ہوئی۔'' قرآن کریم کو اللہ تعالیٰ نے نوع انسان کے لئے نعمت عظمیٰ قرار دیا ہی اور ان سے کہا ہے کہ تم ایسی عظیم متاع کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔

قل بفضل الله و برحمته فبذٰلک فليفر حوا. هو خير مما يجمعون. (۱۰/۵۸).

اے رسول! ان سے کہہ دو کہ تمہیں یہ متاعِ گراں بہا بلامزدو معاوضہ مل گئی ہے۔ اس کے ملنے پر تم جشن مناؤ۔ تم جو کچھ بھی دنیا میں جمع کرو' یہ اس سے زیادہ گراں قدر ہے۔

لہٰذا' جسے عید الفطر کہا جاتا ہے وہ درحقیقت جشنِ نزول قرآن ہے۔ قرآن' خدا کی کبریائی کا ضابطۂ ہدایت ہے اور رمضان کے مہینے کے روزے مجاہدین کو خدا کی کبریائی قائم کرنے اور مستحکم رکھنے کا پروگرام۔ اس پروگرام کے بخیروخوبی انجام پانے پر جشن مسرت بالکل فطری

عمل ہے۔

یہ تھا دین میں روزں کا مقصد۔یعنی لتکبرو اللہ علی ماھدٰکم. تا کہ زمین پر خدا کی حکومت قائم کی جائے لیکن جب دین مذہب میں تبدیل ہو گیا تو قرآن کریم کے یہ الفاظ تو باقی رہ گئے لیکن ان کی غرض وغایت بالکل بدل گئی۔آپ قرآن کریم کا کوئی سا باترجمہ نسخہ اٹھا کر دیکھیں۔اس میں ان آیات کا ترجمہ ان الفاظ میں ملے گا۔''تا کہ تم خدا کی بڑائی کرو''۔یعنی دین میں ان الفاظ کا مفہوم خدا کی کبریائی قائم کرنا تھا۔مذہب میں ان کا مطلب خدا کی بڑائی بیان کرنا رہ گیا۔کبریائی قائم کرنے اور بڑائی بیان کرنے میں جو فرق ہے وہ واضح ہے۔اس ''بڑائی بیان کرنے'' کے حکم کی اطاعت کے متعلق کہا گیا کہ نماز عید میں جو چھ تکبیریں زائد کہی جاتی ہیں ان سے اس حکم کی تعمیل ہو جاتی ہے۔اذان۔نماز اور عیدین کی تکبیریں اپنی اپنی جگہ بجا اور درست لیکن یہ تکبیریں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ یا ایک واقعہ کا اعلان تھیں۔یعنی اس واقعہ کا اعلان کہ یہاں خدا کی کبریائی قائم ہے۔اس حقیقت کے وقوع پذیر ہوئے بغیر اس قسم کے اعلانات صرف چند الفاظ کا اعادہ ہیں۔حقیقت اور اس کی رسمی ادائیگی کا یہی وہ فرق تھا جس کے احساس سے اقبالؒ کے دردمند دل نے باصد آہ وفغاں کہا تھا کہ ؎

الفاظ و معانی میں تفاوت نہیں لیکن
ملّا کی اذاں اورؔ مجاہد کی اذاں اور!
پرواز ہے دونوں کی اسی ایک جہاں میں
کرگسؔ کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

یہ مجاہد کی اذان تھی جو دن میں متعدد بار چھت اور مینارہ پر کھڑے ہو کر دنیا میں اعلان کرتی تھی کہ

اللہ اکبر

کبریائی صرف خدا کے لئے ہی مختص ہے۔اس میں کوئی اور شریک نہیں ہو سکتا اور اس کے بعد وہ اعلان کرتا تھا کہ

اشھد ان لا الٰہ الا اللہ

میرا یہ اعلان اس حقیقت کی شہادت دیتا ہے کہ خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں۔آپ نے کبھی اس پر بھی غور فرمایا کہ اس اعلان میں یہ نہیں کہا گیا کہ میں اس بات کا اقرار کرتا ہوں یا اعلان کرتا ہوں۔کہا یہ گیا کہ میں اس حقیقت کی ''شہادت دیتا ہوں''۔شہادت اسی کی قابلِ قبول ہوتی ہے جسے اس بات کا ذاتی طور پر علم ہو۔جو اس کا عینی شاہد ہو۔اگر کوئی شخص عدالت میں جا کر یہ کہے کہ مجھے اس واقعہ کا

ذاتی طور پر تو علم نہیں۔ میرا خیال یہ ہے یا میں نے ایسا سنا ہے تو اس کی شہادت کا قابل قبول ہونا تو درکنار، اسے درخورِ سماعت بھی نہیں سمجھا جاتا۔ لہٰذا، اشھد ان لا الٰہ اسی کا قابلِ قبول ہوگا جو یہ کہے کہ میں اس کا گواہ ہوں کہ یہاں خدا کے سوا کوئی صاحب اقتدار نہیں۔ یہاں خدا کے سوا کسی کی حکومت نہیں۔ یہاں حکمرانی صرف خدا کی ہے۔ جو اس حقیقت کا شاہد نہیں اسے اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حق حاصل نہیں۔ یہی وہ شہادت ہے جس کے متعلق خود اللہ تعالیٰ نے فرمادیا کہ شھد اللہ انہ لا الٰہ الا ھو۔ ''خدا اس کی شہادت دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں ہے۔'' والملٰئکۃ ''اور ملائکہ جو اس کے اس اقتدار کو بروئے کار لانے کے لئے مامور ہیں وہ بھی اس کی شہادت دیتے ہیں''۔ انہیں بھی اس کا حق حاصل ہے کہ وہ بھی اس کی شہادت دیں، کیونکہ وہ اس کے عینی شاہد ہیں۔ اس کے بعد ہے: واولوا العلم قائما بالقسط۔ ''ان کے علاوہ وہ لوگ بھی اس کی شہادت دے سکتے ہیں جنہیں اس کا علم بھی حاصل ہے اور پھر وہ ایسا نظام متشکل کئے ہوئے ہیں جس میں خدا کی میزانِ عدل قائم ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے ذاتی علم اور مشاہدہ کی بناء پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ لا الٰہ الا ھو العزیز الحکیم (۳/۱۷) ''خدا کے سوا کوئی صاحبِ اقتدار نہیں اور اس کا اقتدار تنہا قوت پر نہیں، بلکہ قوت کے ساتھ حکمت پر مبنی ہے''۔

آپ نے غور فرمایا کہ۔۔۔ قرآنِ کریم کی رو سے اللہ اکبر کہنے کا حق کسے حاصل ہے؟ رمضان کے روزے جماعتِ مومنین کو اس قابل بنا دینے کے لئے تھے کہ وہ ملک میں خدا کی کبریائی قائم کریں اور پھر ساری دنیا کے سامنے اس کی شہادت دے سکیں۔

یہ ہے عزیزانِ من، میری قرآنی بصیرت کے مطابق صیام کی غرض و غایت اور رمضان کا مقصود و منتہیٰ۔

ربنا تقبل من انک انت السمیع العلیم.

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ضرورت رشتہ

ایک بیٹی تعلیم ایم فِل، پلانٹ پتھالوجی، ایرڈ/ بارانی یونیورسٹی راولپنڈی کے لئے موزوں، مناسب رشتہ درکار ہے۔ خواہش مند حضرات درج ذیل نمبر پر رابطہ کر سکتے ہیں۔

موبائل: 0331-8739547

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

ملک حنیف وجدانی

قرآن فہمی کے چند نکات

(حاصلِ مطالعہ)

معزز خواتین وحضرات! ہم اہل پاکستان ایک بے کردار سیاسی دورِ آزادی سے گزر رہے ہیں۔ سارے حالات آپ کے سامنے ہیں۔ ان پر انفرادی تبصرے کئے جائیں تو گھنٹوں لگ جائیں۔ اجتماعی طور پر حالات کی نزاکت کے عین مطابق مفکرِ قرآن جناب پرویز صاحب کے درس کی تقریروں سے کچھ تحریری اقتباس پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

☆ شرح صدر، درسِ قرآن سورۃ الزمر۔ صفحہ 346۔

''آپ نے دیکھا کہ قرآن حکیم نے شرح صدر بتایا ہے۔ اسلام کے لئے شرط یہ بتائی ہے کہ قوانین فطرت اور ان کی نتیجہ خیزی پر غور وفکر کرو اور اس سے پھر اس نتیجے پر پہنچو کہ جو قوانین قوموں کی فلاح و بہبود اور بتاہی کے لئے دیئے گئے ہیں وہ اسی طرح سے اٹل ہیں جس طرح فطرت کے قوانین اٹل ہیں۔''

☆ ''كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا (39:23)- اس کے اندر باہمی ربط ہے۔ ایک مضمون کو دوسرے کے ساتھ مشابہت حاصل ہے۔ اس میں کسی طرح سے بھی تضاد نہیں ہے۔ یہ سب چیزیں ملتی جلتی ہیں لیکن اس کے لئے تو غور وفکر چاہئے۔ شرح صدر کی ضرورت ہے۔ یہ ان آنکھوں سے دیکھا جا سکتا ہے کہ کس طرح ان میں ربط باہمی ہے اور جو غور وفکر کو ہی حرام سمجھیں؟''

☆ مَّثَانِيَ (39:23)' دو متضاد چیزوں سے حقیقت کو واضح کرنا۔ دو متضاد چیزوں کو آمنے سامنے لاکر مطلب کی وضاحت کرنا اور یہ ایک بڑا ہی مؤثر و بین طریق ہوتا ہے۔ مثلاً روشنی کے مقابلے میں تاریکی' بات روشنی کی سمجھ آجاتی ہے جب پتہ ہو کہ تاریکی کیا ہوتی ہے۔ اگر کہیں تاریکی ہو ہی نہیں۔ تو آپ سمجھیں ہی نہیں کہ روشنی کسے کہتے ہیں۔'' (ص 347)۔

☆ ''یہ جو چیز ہے کہ وہ سچ بولے یہ قلب کی چیز ہے۔ قلب محسوس کرے کہ جھوٹ بولنے سے نقصان ہوگا اور سچ بولنے سے فائدہ ہوگا۔ یہ ہے کہ ''قلب محسوس کرے'' دماغ تو صرف دلائل دے گا۔'' (ص 348)۔

''اسی لئے قرآن قلب سلیم پر زور دیتا ہے کہ قلب جھک جائے قلب ان چیزوں کے سامنے جھک جائے جنہیں عقل نے صحیح مانا ہے پھر آدمی صحیح راستہ اختیار کرتا ہے۔'' (ص 348)۔

☆ خواتین کے سیاسی حقوق۔

19 جولائی 1970ء کے درس قرآن میں خواتین کو سیاسی حقوق کی تحریک دیتے ہوئے فرماتے ہیں:

''میں نے اس مرتبہ اپنی ان بہنوں اور بیٹیوں کے لئے لکھا ہے کہ اسمبلی کی نشستوں کے لئے کوئی پابندی نہیں کہ ان پر صرف مرد ہی ممبر منتخب ہو سکتے ہیں۔ عورت ممبر نہیں ہو سکتی قانوناً اس میں کوئی ایسی پابندی نہیں ہے۔ یہ بھی کھڑی ہوں ووٹ لیں اور سیٹیں حاصل کریں۔'' (سورۃ النساء، صفحہ 195)۔

☆ برادران عزیز! ہم نے ان عورتوں پر یہ بات افشا ہی نہ ہونے دی کہ تم بھی اسمبلیوں کی ان سیٹوں کی ممبر بن سکتی ہو۔ ان کی آبادی آدھی سے کہیں زیادہ ہے تو آدھی سیٹوں کے اوپر جا کر بیٹھ سکتی ہیں۔'' (ص 195)۔

اگر محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ کو محترم پرویز صاحب کی اس تقریر (19-7-1970) کا پتہ چل جاتا تو وہ 19 جولائی کو خواتین کا یوم حقوق قرار دے دیتیں کیونکہ یہ 1973ء کے آئین سے بہت پہلے کی بات ہے اور پاکستان کی تاریخ کا ایک منفرد واقعہ ہے۔

☆ سیروفی الارض۔

کائنات میں اللہ کی آیات بکھری پڑی ہیں۔ ہم یونہی ان کے پاس سے گزر جاتے ہیں سورۃ النساء کے درس میں صفحہ 592، میں پرویز صاحب فرماتے ہیں:

''قرآن کریم نے مومن کی زندگی کا فریضہ قرار دیا ہے کہ سیروافی الارض (6:11)-''

''قوموں کی زندگی میں یہ جو ایک خاص زمین میں درختوں کی طرح کھڑے رہنا ہے کہ ہل ہی نہیں سکتے، نہیں ہے۔ ایسی قومیں دنیا میں ترقی نہیں کر سکتیں۔ قومیں وہ ہیں جن کے لوگ ایک مقام پہ پیدا ہوتے ہیں لیکن آپ دیکھئے کہ کس طرح وہ ساری دنیا میں پھیلتے چلے جاتے ہیں۔'' (ص 592)۔

پرانے زمانے کے افراد کے سفرنامے پڑھنا بھی ضروری ہے کیونکہ سیروافی الارض پر انہوں نے کافی کام کیا ہے اور اب تو تحت الثریٰ تک جا رہے ہیں۔

☆ مہر سے میاں بیوی کا استفادہ۔

فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ (4:24)-

اسْتَمْتَعْتُم کے معنی ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا ہے۔ یہاں سے متعہ کا لفظ نکالا گیا۔

''میاں بیوی منفعتِ باہمی کی بنیاد پر میاں بیوی بنتے ہیں۔ ایک دوسرے کا فائدہ ہوتا ہے۔ اس میں منفعت ہوتی ہے۔'' (سورۃ النساء' صفحہ 247)۔

''نکاح کی ایک شرط مہر بھی ہے اور یہ وہ چیز ہے جو تم نے محبت کے اظہار پر تحفہ کی صورت میں دیا ہے یہ میاں بیوی کے تعلقات کی خوشگواری ہے۔'' (ص 249)۔

''آپس میں محبت کی بنا پر ایک دوسرے کے رفیق بن گئے۔ تزویج کی زندگی بن گئی۔ اب دونوں میں کونسی چیز ایسی ہے۔ جو مشترک نہیں ہے۔'' (ص 249)۔

''قانون کے بعد جب محبت کی بات آتی ہے تو کہتا ہے کہ اس کے اندر قانون کیا ہوتا ہے۔ سارا دے دو۔ آدھا دے دو یہاں تک محبت کی بات ہے۔ ان اللہ کان علیما حکیماً 4:24''۔

''ہمیں علم ہے اس لئے ہم نے قانون کی بات کر دی اور حکیماً 4:24 حکمت بھی آئی ہے۔ حکمت کی بات یہ ہے کہ آگے قانون کی جکڑ بندی نہیں ہوتی۔ محبت کی بنا پر باہمی رضامندی سے یہ کرنا چاہتے ہیں۔ اس میں کمی بیشی کر لو اس میں حرج کی کوئی بات نہیں ہے۔'' (ص 250)۔

☆ رَعْدٌ وَّبَرْقٌ (2:19)-

قرآن کریم میں برق کا لفظ 2:19 ,2:20 میں آیا ہے۔

برق پر غور و فکر کرنے والے ایک مرد خدا کی مثال دینا چاہوں گا۔ بجلی کا آسمانی مظاہرہ بادلوں میں تو ہر کوئی دیکھتا ہی رہتا ہے۔ اس کو تسخیر کرنے کے نقطۂ نظر سے دیکھا جائے تو بڑا اہم نام سامنے آتا ہے' ایڈیسن!

ایڈیسن کو بجلی مسخر کرنے کا عشق کی حد تک یا غور و فکر سے آگے جنون سا ہو گیا تھا۔ جب اس نے طویل جدوجہد کے بعد بلب روشن کر لیا تو اس کرۂ ارضی پر چند لوگوں کے ہمراہ خوشی سے پھولے نہیں سماتا تھا' رات جگے اور تھکن سے چور ایڈیسن کو مشورہ دیا گیا کہ اب ذرا آرام کر لے تو اس نے جواب دیا کہ وہ رات بھر خود اس جلتے بلب کی نگرانی کرے گا' چنانچہ 20 اکتوبر 1879ء بروز پیر صبح 8 بجے تک ایڈیسن اس بلب کو دیکھتا رہا۔ آدھی رات کو بیوی کے ہمراہ کھانا کھایا تھا۔

آج ساری دنیا اس بلب کی گرویدہ ہے اور جب بجلی نہیں آتی تو جو کچھ ہوتا ہے یا جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ سب کچھ آپ کے سامنے ہے۔ یہ قرآن کی ایک آیت کی تفسیر وتسخیر ہے۔ بلکہ عملی مظاہرہ ہے اور یہ مومن کی شان ہونی چاہئے۔

محترم خواتین وحضرات! اگر اس کرۂ ارضی پر نوع انسانی کے اندر قرآنی نظام ربوبیت کا ایک بلب روشن ہو جائے تو اس اعجاز کو نوع انسانی' بقول شاعر

تماشا کر اے محوِ آئینہ داری
تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں

معزز خواتین وحضرات اس کے لئے ایڈیسن سے زیادہ شب وروز محنت کرنا پڑے گی۔ آیئے اس کے لئے فداکاری کی کوئی مثال ہی قائم کردیں اور سورۃ النساء کے دروس جو کتابی شکل میں آگئے ہیں ان کو ہر لائبریری اور ہر اہل علم تک پہنچائیں۔ والسلام!

☆☆☆☆☆☆☆☆

شجرکاری

☆ باغبان ایسوسی ایشن کا ماٹو ''**قرآن فہمی اور باغبانی**'' ہے۔

☆ باغبانوں کے غیر رسمی اجتماعات ہر مہینے کی 15-30 تاریخ کو ہوتے ہیں۔

☆ آنے والے دنوں میں شجرکاری ہوگی' آپ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں۔

☆ دوستوں کو پھلدار پودہ جات کا تحفہ دیں۔

☆ نرسریاں قائم کریں۔

پتہ رابطہ: طارق ایم ملک

شعبۂ نشر واشاعت' باغبان ایسوسی ایشن' چارہان' نیومری

عید مبارک

جشن نزول قرآن مجید

پر

پیشگی ھدیہ تبریک قبول فرمایئے

اے نوع انسانی!

تمہارے پاس تمہارے نشوونما دینے والے کی طرف سے ایک ضابطہ حیات آ گیا ہے جو ہر اس کشمکش کا علاج ہے جو تمہارے سینوں کو وقف اضطراب رکھتی ہے۔ جو قوم اس کی صداقتوں پر یقین رکھتی ہے یہ اس کی راہنمائی' زندگی کی منزل مقصود کی طرف کرتا ہے اور اسے سامان نشوونما سے بہرہ یاب کر دیتا ہے۔

کہو کہ یہ خدا کے فضل و رحمت سے عطا ہوا ہے۔ لہٰذا تمہیں چاہئے کہ ایسے ضابطہ حیات کے ملنے پر جشن مسرت مناؤ۔ یہ اس تمام ساز و سامان سے بہتر ہے جسے تم جمع کرتے ہو۔

(القرآن الکریم' یونس 10' آیت 58)

عید کا چاند

ثمینہ بلال

عید کے چاند تم کو آنا ہو تو
میری چھت پہ قیام مت کرنا
بارشوں میں یہ چھت ٹپکتی ہے
بادلوں میں مقام مت کرنا
میرے گھر میں جو شام ہوتی ہے
مفلسی پیٹ بھر کے سوتی ہے
میرے بچے جو بھوکے سوتے ہیں
اُن کی ماں ہچکیوں میں روتی ہے
عید کے چاند مجھ کو تو ہی بتا
نئے کپڑے کہاں سے لاؤں میں
چوڑیاں مہنگی ہو گئیں وہ بھی
اپنی بیٹی کو کیا دلاؤں میں
عید کے چاند تم سے کیسے کہوں
میرے بچے نے مجھ سے مانگا ہے
نئے کپڑے نبی ﷺ کی سنت ہیں
اس نے جوڑا پرانا مانگا ہے
ان کو تعلیم کیسے تحفہ دوں
میں جنہیں بھوک روز دیتا ہوں
قرض مانگا تھا جو بُرے دن سے
اس پہ میں سود روز دیتا ہوں
عید کے چاند کیا خبر ہے تمہیں
کتنی آنکھوں کو خوں رُلاتا ہے
کتنے ہی خواب ٹوٹ جاتے ہیں
تو جو نینوں میں جھلملاتا ہے
کتنی ماؤں کی کوکھ جلتی ہے
تو فلک پہ جو جلنے آتا ہے
کتنے ہی باپ منہ چھپاتے ہیں
تو جو پردے سے مکھ دکھاتا ہے
کتنے مفلس ہی ہاتھ ملتے ہیں
جب کوئی عید ملنے آتا ہے
تو سارے بچوں کا چندا ماموں ہے
آدھے بچوں کو کیوں رُلاتا ہے
عید کے چاند التجا ہی سمجھ
کسی بددل کی بددعا ہی سمجھ
اس برس میرے گھر میں مت آنا
اس برس مفلسی کے ڈیرے ہیں
اور اگلے برس جو بچوں کو
عید کی میں خوشی نہ دے پایا
تو مجھے اپنے ساتھ لے جانا
میرے بچوں کو خواب دے جانا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عطاء الحق قاسمی
attaul.haq@janggroup.com.pk

آزمائش شرط ہے!

میں نے فٹ پاتھ پر ایک مناسب سی جگہ منتخب کی اور پھر اس پر چادر بچھا کر بیٹھ گیا۔ مگر کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ فٹ پاتھ پر چادر بچھا کر بھیک مانگنا گداگری کے آداب کے منافی ہے۔ چنانچہ میں نے چادر کھینچ لی اور ننگی زمین پر بیٹھ گیا۔ میں نے جیب میں سے ایک چھوٹا سا آئینہ نکالا اور اپنا چہرہ اس میں دیکھنے لگا۔ گزشتہ پانچ چھ دن کا بڑا ہوا شیو اپنی بہار دکھا رہا تھا بلکہ ننھے منے سفید بال میری جوانی چھپانے میں تھوڑے بہت مددگار ثابت ہو رہے تھے۔ میں نے اپنی اداکاری کی تمام صلاحیتیں بروئے کار لاتے ہوئے چہرے پر دکھ اور کرب کے آثار پیدا کئے اور حلق سے نہایت دردناک آواز نکالی ''مجھ غریب کی مدد کرتے جاؤ بابا!'' مگر پھر میں نے محسوس کیا کہ قریب سے تو کوئی بھی نہیں گزر رہا اور یوں میں خواہ مخواہ اپنی انرجی ضائع کر رہا ہوں۔ چنانچہ میں نے اپنے ان فرصت کے لمحات میں جیب سے بنک کی ڈیپازٹ سلپ نکالی اور اس میں رقم بھرنے لگا جو گزشتہ روز کی گداگری کے طفیل میری جیب میں تھی۔ مجھے کل یہ رقم بنک جمع کرانے کا وقت نہیں مل سکا تھا اور وہ اس وقت سے میری جیب میں تھی۔

جس سڑک کو میں نے اپنا ''دارالحکومت'' بنایا تھا اس پر زیادہ رش نہیں تھا۔ پیدل چلنے والے لوگ بھی کم تھے اور ادھر سے گاڑیاں بھی دوسرے علاقوں کی نسبت کم گزر رہی تھیں۔ فٹ پاتھ کے ساتھ قبرستان کی دیوار تھی۔ یہ جگہ میں نے اس لئے منتخب کی تھی کہ پولوشن والے علاقے میں مجھ سے بیٹھا نہیں جاتا اور کم ٹریفک کی وجہ سے اس علاقے میں پولوشن کم تھی۔ مجھے قبرستان کے قریب بیٹھنا بھی پسند نہیں تھا کہ اس طرح بندہ خواہ مخواہ عزرائیل کی نظروں میں آ جاتا ہے مگر یہ میری مجبوری تھی۔ میں اس ہمسائیگی کی وجہ سے ویسے ہی اندر سے خوفزدہ تھا۔ اوپر سے مجھے یہ بھی لگتا تھا جیسے کچھ مردے خراٹے لے رہے ہیں، ممکن ہے یہ میرا وہم ہو یا وہ تازہ تازہ دفن ہوئے ہوں، اتنے میں اچانک میری نظر اپنے دائیں جانب سے آتے ایک صاحب قسم کے شخص پر پڑی جس نے امپورٹڈ سوٹ پہنا ہوا تھا، جی ہاں میں امپورٹڈ سوٹ دور ہی سے پہچان لیتا ہوں۔ اس نے بہت خوبصورت اور مہنگی نک ٹائی بھی لگائی ہوئی تھی۔ میں نے فوراً اپنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر انہیں بے ترتیب کرنے کی کوشش کی اور ابھی وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر تھا کہ میں نے آواز لگائی ''غریب کو کچھ دیتے جاؤ بابا'' وہ میرے قریب پہنچ کر رک گیا۔ اس نے کچھ دینے کی بجائے مجھے مخاطب کیا اور کہا ''تم نوجوان آدمی ہو، تمہیں بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں

آتی ؟''

میں نے جواب دیا ''بابو جی آتی ہے مگر کیا کروں مجبوری ہے۔''

اس نے پوچھا ''تمہیں کیا مجبوری ہے؟''

میں نے کہا ''وہی جو آپ کی ہے''

بولا ''میں تو بھیک نہیں مانگتا''

میں نے پوچھا ''بابو جی پھر آپ کھاتے کہاں سے ہیں؟''

اس نے کہا ''میں ایک این جی او چلاتا ہوں اور امریکہ سے اس کے لئے فنڈز لیتا ہوں'' اس پر میں نے قہقہہ لگایا اور کہا ''آپ بے شک میری مدد نہ کریں' مگر یہ تو نہ کہیں کہ آپ فقیر نہیں ہیں'' اس پر وہ پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

اسے گئے ہوئے ابھی تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی کہ مجھے لاؤڈ اسپیکر پر ایک آواز سنائی دی ''جزاک اللہ' شیخ صاحب نے سو روپے بھجوائے ہیں۔ جزاک اللہ جزاک اللہ' ملک صاحب کی بچی پچاس روپے لے کر آئی ہے' جزاک اللہ جزاک اللہ' بٹ صاحب پانچ سو روپے دے کر گئے ہیں' بٹ صاحب نیک کاموں میں ہمیشہ دل کھول کر چندہ دیتے ہیں۔ جزاک اللہ' جزاک اللہ' رانا صاحب.....'' مگر میں نے ان اعلانات سے اپنی توجہ ہٹا کر اس طرف دیکھا جدھر سے ایک شخص میلے سے کپڑے پہنے سائیکل پر چلا آ رہا تھا۔ اس نے سائیکل کے کیریئر پر ایک بڑا سا لکڑی کا باکس فکس کیا ہوا تھا۔ میں نے ایک بار پھر اپنی دردناک آواز میں ''غریب کی مدد کرو بابا'' کا جملہ دہرایا۔ اس شخص نے میرے قریب پہنچ کر سائیکل کو بریک لگائی اور غور سے میرے چہرے کو دیکھنے لگا۔ پھر بولا ''تم نوجوان آدمی ہو۔ تمہیں بھیک مانگتے ہوئے شرم نہیں آتی ؟''

میں نے کہا ''آتی ہے مگر یہ بتاؤ تم کیا کرتے ہو؟''

اس نے جواب دیا ''میں ڈاکٹر ہوں اور خارش کی دوا بیچتا ہوں اس دوا کے استعمال سے پرانی سے پرانی خارش بھی ایک دن میں ختم ہو جاتی ہے۔''

میں نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے پوچھا ''تم نے یہ دوا کا نسخہ کہاں سے لیا ہے؟''

اس نے جواب دیا ''یہ نسخہ میری اپنی ایجاد ہے''

میں نے کہا ''دن میں کتنے پیسے کما لیتے ہو؟''

بولا ''پانچ سات سو کی دہاڑی لگ جاتی ہے۔''

میں نے کہا ''دیکھو استاد! ہم دونوں لوگوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں' میں فقیر بن کر ان سے پیسے بٹورتا ہوں اور تم ڈاکٹر بن کر ان کی جیبیں کترتے ہو۔ نہ تم ڈاکٹر ہو اور نہ میں محتاج ہوں' لہٰذا اپنی نیک کمائی سے پانچ سات روپے ڈھیلے کرو'

تم جس طرح کی دوا بیچتے ہو میں تمہارے لئے اسی طرح کی دعا کروں گا۔''

یہ سن کر وہ ہنسا اور اس نے دس روپے کا نوٹ میری طرف بڑھا دیا۔ اس کے بعد وہ جاتے جاتے واپس مڑا اور میری طرف پشت کر کے ایڑھیوں کے بل بیٹھتے ہوئے اس نے اپنی قمیض اوپر اٹھائی اور کہا ''استاد ذرا میری کمر پر خارش تو کرو۔''

میں محسوس کر رہا تھا کہ پیدل چلنے والے بہت کم ہیں' ویسے بھی جو شخص پیدل ہو اس سے بھیک مانگتے ہوئے تھوڑی سی شرم بھی محسوس ہوتی تھی' ان میں سے بیشتر تو ایسے تھے جن کی مدد کرنے کو میرا اپنا دل چاہتا تھا مگر یہ بات میرے پیشے کی اخلاقیات کے منافی تھی۔ چنانچہ میں فٹ پاتھ سے اٹھا اور ٹریفک سگنل کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا۔ یہاں بڑی بڑی گاڑیوں میں بیٹھے ہوئے بڑے بڑے فقیروں سے میری ملاقات ہوئی۔ ان میں وزیر تھے' مشیر تھے' اسمبلی کے ارکان تھے' تاجر تھے' دانشور تھے' سجادہ نشین تھے' جاگیردار تھے' وڈیرے تھے' مگر میں ان فقیروں سے بھی کچھ نہ کچھ ہتھیانے میں کامیاب رہا اور آپ کو یہ سب کچھ بتانے کا مقصد محض اپنے اس دلی افسوس کا اظہار تھا کہ آج تک کسی حکومت نے میری اس صلاحیت سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ تاہم میں مایوس نہیں ہوں' مجھے یقین ہے کہ آج نہیں تو کل کسی مردم شناس حکومت کی نظر مجھ پر ضرور پڑے گی اور مجھے پاکستان کا وزیر گداگری مقرر کر دیا جائے گا ہمارے وزرائے اعظم اور صدور تک نے ہاتھ میں کشکول بھی پکڑا' دنیا بھر میں گداگر بھی کہلائے مگر وہ بھیک میں آٹا لے کر مطمئن ہوتے رہے۔ کاش مجھے کوئی آزما کر دیکھے!

(بشکریہ روزنامہ جنگ لاہور' 28-1-2012)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

دوا ہم دیتے ہیں.....شفا اللہ تعالیٰ دیتے ہیں

امراض قلب یا دل کے والو بند ہوں تو آپریشن کی ضرورت نہیں' اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کر کے
امراضِ قلب کورس' صرف 15 یوم استعمال کریں اور اپنے ٹیسٹ دوبارہ کروائیں
انشاءاللہ دل کے والو کھل جائیں گے اور امراض قلب سے نجات مل جائے گی۔

آزمودہ نسخہ

ابھی فون کریں لاہور میں ہوم ڈلیوری کی سہولت
فوری کورس حاصل کریں۔

حمزہ دواخانہ' حکیم صاحب' موبائل: 0344-4211085' ای میل: miankhalil1000@yahoo.com

پتہ: قادری چوک نزد طارق سٹور' 1۔ راؤں روڈ' اچھرہ' لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

منصور آفاق

لندن کا بُت کدہ

مادام تساؤ لندن میں ایک ایسی جگہ ہے جسے دیکھے بغیر لندن کی سیاحت مکمل نہیں ہوتی۔ گذشتہ دنوں جب میں احسان شاہد اور ڈاکٹر طاہر تونسوی کو وہاں لے کر گیا تو ہمارے ساتھ پاکستان سے آئے ہوئے ایک مولانا بھی تھے' وہ تو پریشان ہو گئے کہ ہم انہیں کسی بت خانے میں لے آئے ہیں' وہ کسی مومی مجسمے کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھتے تھے' نظریں نیچی کر کے چل رہے تھے اور بار بار کہتے تھے مجھے فوراً اس بت کدے سے باہر نکالو۔ میں نے انہیں سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ یہی بت آپ کی جیب میں بھی ہیں۔ آپ نے جو کرنسی اپنے پرس میں رکھی ہوئی ہے اس پر ملکہ برطانیہ کی تصویر بنی ہوئی ہے اور جو سکے ہیں آپ کے پاس' ان پر بت ڈھالے گئے ہیں۔ آپ کے پاسپورٹ پر بھی آپ کی تصویر لگی ہوئی ہے۔ تصویر یا بت بنانا اس وقت تک کوئی گناہ نہیں جب تک بنانے والے کی نیت یہ نہ ہو کہ اس کی عبادت کی جائے گی۔ میں نے اپنے طور پر انہیں سمجھانے کے لئے کہا کہ جہاں تک میرا خیال ہے اسلام میں صرف اس تصویر یا بت کی ممانعت کی گئی ہے جو عبادت کے لئے بنایا گیا ہو حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق قرآن حکیم میں ہے کہ انہوں نے مختلف علاقوں کے نادر فنکار صناع اپنے ہاں جمع کر رکھے تھے۔

یہ حضرت سلیمانؑ کی منشا کے مطابق ان کے لئے بڑے بڑے خوبصورت محلات تعمیر کرتے اور ان میں مجسمے تراش کر یا تصویریں بنا کر رکھتے تھے) تماثیل کا لفظ مجسمہ اور تصویر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ تصاویر اور مجسموں کے لئے ابتداء میں احتیاط برتی گئی کیونکہ اسلام نے بت پرستی کا قلع قمع کرنا چاہا تھا' جب مسلم معاشرہ میں بت پرستی کا اندیشہ باقی نہ رہا تو علماء نے اس سلسلہ میں پہلے کی سی شدت چھوڑ دی اور نرم گوشے پیدا کر لئے۔ بڑے بڑے مدعیان شریعت جو ماضی قریب میں تصویر اتروانا تو کیا تصویر دیکھنا بھی حرام سمجھتے تھے اب خوش ہو کر تصویریں کھنچواتے ہیں۔ اخبارات میں اپنی تصویریں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں' ٹی وی پر پروگرام لیتے ہیں اور اپنے جلسوں کی فلمیں بنواتے ہیں جہاں تک مجسمہ سازی کا تعلق ہے کچھ سال پہلے مولانا مودودی کو شاہ فیصل ایوارڈ دیا گیا تھا یہ ایوارڈ کیا تھا اس کے Medal میں شاہ فیصل مرحوم کی تصویر ڈھلی ہوئی تھی یہ تو تصویر سے آگے بڑھ کر مجسمہ کی ذیل میں آتا ہے۔

اس باب میں بھی حضرت عمرؓ کا مسلک بطور مثال پیش کیا جا سکتا ہے ابتدا میں اگرچہ بت پرستی کے استیصال پر زور دیا گیا تھا لیکن ذہنیت بدلنا مقصود تھا اس لئے جب مدائن کی فتح کے بعد اسلامی لشکر کسریٰ کے قصر ابیض میں داخل ہوا تو اس

میں ادھر ادھر مجسموں کے حسین و جمیل شاہکار نصب تھے حضرت سعد بن وقاصؓ نے انہیں بڑی احتیاط سے محفوظ رکھا اور حضرت عمرؓ نے ان کے اس فیصلے کی تقویت فرمائی اور ان مجسموں کو ضائع ہونے سے بچا لیا (شاہکار رسالت)۔ نقاشی میں مسلمان مصوروں کی بڑی خدمات ہیں چغتائی اور صادقین کے نام آج بھی زندہ ہیں۔

یہ ساری گفتگو وہی ہے جو میں نے ان مولانا کے ساتھ کی مگر انہوں نے کہا ''اسلام بت تراشی کی اجازت نہیں دے سکتا چاہے وہ کسی مقصد کے لئے کیوں نہ ہو۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ انسان علمی و فکری میدان میں بہت زیادہ ترقی کر چکا ہے مگر بت پرستی ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ آج بھی بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگ بت پرست ہیں اور اسے جائز سمجھتے ہیں۔ کسی مجبوری کے عالم میں تصویر بنوانا یا اسے اپنے پاس رکھنا تو جائز قرار دیا جا سکتا ہے مگر بت تراشی جائز نہیں ہو سکتی۔'' میں نے اسے بہت سمجھایا کہ ٹیلی ویژن پر تو وہی بت زندہ دکھائی دیتا ہے اسے آپ جائز سمجھتے ہیں مگر وہ بت جو بولتا نہیں ہے حرکت نہیں کرتا ہے' پتھر یا موم کا ہے وہ جائز نہیں ہے۔ مولانا صاحب کہنے لگے۔ ''دیکھئے بہت سے علمائے کرام تو تصویر کو چاہے وہ پاسپورٹ کے لئے یا اخبار میں شائع ہونے کے لئے ہی کیوں نہ بنوائی جائے حرام سمجھتے ہیں مگر میں تو بہت آزاد خیال آدمی ہوں۔ تصویریں بنانے یا بنوانے کو حرام نہیں سمجھتا مگر بت تراشی کو جائز نہیں کہہ سکتا۔ مسلمان بت شکن ہے وہ بت فروش نہیں ہو سکتا۔ علامہ اقبالؒ بھی فرما گئے ہیں:

قوم اپنی جو زر و مال جہاں پر مرتی
بت فروشی کے عوض بت شکنی کیوں کرتی''

اور مجھے طالبان یاد آ گئے۔ جو کسی مقصد کے لئے بھی انسانی تصویر بنوانا حرام سمجھتے ہیں۔ ان کے نظریات ذہن میں لہرائے تو مجھے اپنے ساتھ چلتے ہوئے مولانا صاحب بہت اچھے لگے۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اسلام جیسا عظیم مذہب کسی آرٹ کو حرام نہیں قرار دے سکتا۔ میری علمائے کرام اور مشائخ عظام سے درخواست ہے کہ اس مسئلے پر کچھ رہنمائی فرمائیں۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک عظیم قرآنی خزانہ

قرآن مجید پر غور و فکر کرنے والوں کے لئے خوشخبری

مفکرِ قرآنِ مجید علامہ پرویزؒ صاحب کی زندگی بھر کی قرآنی بصیرت کو دیکھا اور سنا جا سکتا ہے۔

WWW.TOLUISLAM.COM

سی ڈی اور کتب کی خریداری ☆ بیرون ملک bazmdenmark@gmail.com, PDF.EBOOK

☆ اندرون ملک' فون: 35753666 42 92+' ای میل: trust@toluislam.com

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

غلام احمد پرویز

میں تجھ کو بتاتا ہُوں تقدیر اُمم کیا ہے

پاکستان کے متعلق

خدائی فیصلہ

(قسط اول)

(یہ خطاب اس کنونشن کے لئے لکھا (اور چھاپا) گیا تھا جو اخیر نومبر 1971ء میں منعقد ہوئی تھی۔ وہ کنونشن، جنگ کی وجہ سے پیدا شدہ حالات کی وجہ سے ملتوی ہوگئی اور 20 لغایت 23 اپریل 1972ء کو منعقد ہوئی جس میں یہ خطاب پیش کیا گیا۔ اس دوران میں (یوں کہئے کہ) وہ خدائی فیصلہ جس کا اس میں ذکر ہے فطرت کی طرف سے صادر ہوگیا۔ بایں ہمہ وہ حقائق جن پر وہ فیصلہ مبنی تھا اپنی جگہ پر بدستور قائم ہیں۔ اس لئے اس خطاب کو دوبارہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جا رہا ہے۔)

دیدۂ عبرت کشا!

قرآن کریم انسانی تاریخ کو بڑی اہمیت دیتا ہے۔ اتنی اہمیت کہ اس نے کہا ہے کہ: وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ اٰيٰتٍ مُّبَيِّنٰتٍ وَّمَثَلًا مِّنَ الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ (24:34)- ہم نے تمہاری طرف واضح قوانینِ زندگی نازل کئے اور اس کے ساتھ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بھی۔ اقوامِ سابقہ کی سرگزشتیں بیان کرنے سے مقصد کیا تھا' یہ نکتہ قابلِ غور ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جس طرح خارجی کائنات میں کوئی واقعہ یونہی اتفاقیہ نمودار نہیں ہوتا' وہ نتیجہ ہوتا ہے ان قوانینِ فطرت کی کارفرمائی کا جن کے مطابق یہ عظیم کارگہِ کائنات سرگرمِ عمل ہے۔ اسی طرح انسانوں کی دنیا میں بھی کوئی تبدیلی یونہی بلا اسباب رونما نہیں ہو جاتی۔ اس کے لئے بھی خدا کی طرف سے اٹل قوانین مقرر ہیں۔ جو قوم ان قوانین کے مطابق اپنا نظام قائم کرتی ہے' وہ زندہ رہتی اور آگے بڑھتی ہے۔ جو ان کی خلاف ورزی کرتی ہے' وہ زوال پذیر ہو کر رفتہ رفتہ تباہ ہو جاتی ہے۔ قرآن نے وہ قوانین بیان کئے ہیں جن سے قوموں کا عروج و زوال وابستہ ہے' اور ان کی صداقت کے ثبوت

کے لئے' اقوامِ سابقہ کی سرگزشتوں کو بطور شہادت پیش کیا ہے یعنی اس نے کہا ہے کہ دیکھو! فلاں قوم نے اپنے ہاں اس قسم کا نظام قائم کیا تو اسے زندگی کی شادابیاں اور خوشگواریاں حاصل ہوگئیں اور فلاں قوم نے اس کی مخالفت کی تو وہ تباہ و برباد ہو گئی اور اس کے بعد' وہ قوم مخاطب اور آنے والی اقوامِ عالم سے کہتا ہے کہ ان قوانین اور ان کی صداقت کے ثبوت میں پیش کردہ ان شواہد کی روشنی میں' تم خود فیصلہ کرلو کہ تم زندہ اور پائندہ رہنا چاہتے ہو یا تباہ و برباد ہونا۔ اگر زندہ و شاداب رہنا چاہتے ہو تو اپنا نظام' قوانین خداوندی کے مطابق متشکل کرو۔ اگر تباہ ہونا چاہتے ہو تو ان کے خلاف روش اختیار کرلو۔ جس قسم کی تمہاری روش ہوگی اسی قسم کا نتیجہ تمہارے سامنے آجائے گا۔ دیکھئے' وہ اس حقیقت کو کیسے واضح الفاظ میں سامنے لاتا ہے جب کہتا ہے کہ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ۔ کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے کہ جو قومیں ان سے پہلے ہوگزری ہیں' اور انہوں نے اسی قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی جس پر یہ گامزن ہیں' تو ان کا انجام کیا ہوا؟ ان کی اجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات کی ٹھیکریاں' ان کی عظمتِ گزشتہ کی درخشندہ داستانیں بھی بیان کرتی ہیں اور اس کے بعد ان کی تباہی و بربادی کی مرثیہ خواں بھی ہیں۔ کَانُوْٓا اَکْثَرَ مِنْھُمْ وَاَشَدَّ قُوَّۃً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ۔ وہ قومیں تعداد میں بھی اس قوم سے زیادہ تھیں جو اب تمہاری مخاطب ہے اور قوت و حشمت میں بھی اس سے بڑھ کر۔ ان کی شان و شوکت کے جھنڈے زمین میں گڑے ہوئے تھے۔ فَمَآ اَغْنٰی عَنْھُمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (40:82) - لیکن جب ان کے غلط نظام کے تباہ کن نتائج کے ظہور کا وقت آیا تو نہ ان کی تعداد کی کثرت ان کے کسی کام آسکی اور نہ ہی ان کی دولت و قوت انہیں اس تباہی سے بچا سکی۔ یہ تباہی ان پر اچانک نہیں آگئی تھی' خدا نے ان کی طرف اپنے پیغمبروں کو بھیجا تاکہ وہ انہیں بتا دیں کہ جس راستے پر وہ چلے جا رہے ہیں وہ انہیں تباہی کے جہنم کی طرف لئے جا رہا ہے۔ فَلَمَّا جَآءَتْھُمْ رُسُلُھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَھُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِھِمْ مَّا کَانُوْا بِہٖ یَسْتَھْزِءُوْنَ (40:83)- لیکن وہ لوگ اپنی دولت اور قوت کے نشے میں اس قدر بدمست اور اپنی ہنرمندیوں اور عیارانہ کارستانیوں پر اس قدر فرحاں اور نازاں تھے کہ انہوں نے ان پیغمبرانِ انقلاب آسمانی کی تنبیہات کا مذاق اڑایا اور ان سے کہا کہ ہم نے جو نظام وضع اور اختیار کر رکھا ہے' اس سے ہمارے ہاں ہُن برس رہا ہے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ ہم تباہیوں کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ آپ تشریف لے جائیے۔ ہم اپنے معاملات کو آپ سے بہتر سمجھتے ہیں لیکن اس کے بعد ہوا وہی جو ان سے وہ آسمانی پیغام رساں کہتے تھے۔ انہیں ان تباہیوں نے گھیر لیا جن کی وہ ہنسی اڑایا کرتے تھے۔ فَلَمَّا رَاَوْا

بَاْسُنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ (40:84) - جب انہوں نے اس تباہی کو اپنے سامنے کھڑا دیکھا تو کہا کہ ہم نظامِ خداوندی کی صداقت پر ایمان لاتے ہیں اور جس نظام کو اس کا ہمسر ٹھہرایا کرتے تھے' اسے مسترد کرتے ہیں۔ فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا (40:85)- لیکن جب تباہی سامنے آ کھڑی ہو تو اس وقت غلط روش سے اجتناب کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ پھر اس قوم کی ہلاکت اٹل ہوتی ہے۔

یہ سنت اللہ ہے

یہ بیان کرنے کے بعد کہا کہ یہ کوئی انوکھی بات نہ تھی جو صرف کسی ایک خاص قوم کے ساتھ مخصوص تھی سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ (40:85) - یہ خدا کی اٹل روش ہے جو تمام اقوامِ سابقہ کے سلسلہ میں جاری وساری رہی ہے۔ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62)- اور تو خدا کی اس روش' اس قانونِ محکم میں' کبھی تبدیلی نہیں پائے گا۔ یہ اٹل اور غیر متبدل قانون ہے جس کے مطابق قوموں کی زندگی اور موت کے فیصلے ہوتے ہیں۔

اشتراکیت کا نظریۂ تاریخ

آگے بڑھنے سے پہلے' ضمناً یہ بیان کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ خود ہمارے دور میں' ایک اور گوشے سے بھی تاریخ کی اہمیت کی آواز بلند کی گئی ہے اور وہ ہے مارکسزم کا گوشہ۔ اس کے پیش کردہ نظریۂ تاریخ کی تفصیل طول طویل ہے لیکن اس کا ملخص یہ ہے کہ ایک معاشی نظام پیدا ہوتا ہے' پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنے عہدِ شباب کو پہنچتا ہے تو اس میں سے ایک اور نظام نمودار ہو جاتا ہے جو اس پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد اس نظام کا بھی وہی حشر ہوتا ہے' جو اس سے ماسبق نظام کا ہوا تھا۔ انسان کی ساری تاریخ انہی تضادات کی باہمی کشمکش کی داستان ہے۔ جسے جدلیت (Dialecticism) کہا جاتا ہے۔ تضادات کی یہ کشمکش اس قدر پُرقوت اور مہیب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ انسان اس کے ہاتھوں مجبور اور بے بس ہے۔ جب مارکس سے پوچھا گیا کہ وہ کون سی ایسی قوت ہے جو اس قدر اٹل اور شہ زور واقعہ ہوئی ہے' تو اس نے کہا کہ اس قوت کا نام تاریخی وجوب (Historical Necessity) ہے۔ یہ اصطلاح ایسی مبہم بلکہ موہوم ہے کہ آج تک کوئی بتا ہی نہیں سکا کہ اس سے بالآخر مفہوم کیا ہے۔ وہ شے ہے کیا جسے اس قدر مہیب اور لافانی قوت حاصل ہے کہ دنیا کی کوئی قوت اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ کوئی اس کا جواب نہیں دے سکا۔ نہ دے سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ مارکس نے خدا اور اس کے قوانین کا انکار کیا تو اس سے اس کے تحت الشعور میں ایک خلا پیدا ہو گیا

لیکن۔۔۔ خلا محال ہے فطرت کے کارخانے میں۔۔۔ اس لئے اسے اس خلا کو پر کرنے کے لئے کسی قوت پر ایمان لانا ضروری تھا۔ اس کے لئے اس نے ''تاریخی وجوب'' کی ایک موہوم سی اصطلاح وضع کر لی اور اس طرح اپنے لاشعوری خلا کو پُر کر لیا۔ یہ حقیقت بادنیٰ تعمق سمجھ میں آ جائے گی کہ کاروانِ انسانیت جن راستوں سے گزرا ہے' تاریخ ان کے ریکارڈ کا نام ہے اور بس۔ اس ریکارڈ کو کون سی قوت حاصل ہو سکتی ہے! یہ ریکارڈ ہمیں یہ بتا سکتا ہے کہ فلاں دور میں کس قسم کے ذرائع پیداوار اختیار کئے گئے اور فلاں زمانے میں کس قسم کا معاشی نظام رائج کیا گیا اور اس کا نتیجہ کیا برآمد ہوا۔ تاریخ' بہرحال انسانی سعی و کاوش اور فکر و عمل کا ریکارڈ ہے اور ریکارڈ کو کوئی قوت حاصل نہیں ہوتی۔

اشتراکیت میں تاریخ کا ایک اور تصور ہے جو اس سے بھی کہیں زیادہ گمراہ کن ہے۔ اسے کہتے ہیں تاریخ کی مادی تعبیر۔ (The Materialist Concept of History) اس تصور کی رو سے کہا یہ جاتا ہے کہ انسانی تاریخ میں جس قدر ٹکراؤ سامنے آتے ہیں' ان کا جذبۂ محرکہ محض معاشی (یعنی مادی مفاد کا تصادم) تھا۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے سامنے مسئلہ سارا روٹی کا ہے۔ اس کے سوا کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ حق و باطل' خیر و شر' ہدایت و ضلالت' نیکی بدی وغیرہ کے تصورات یا امتیازات سب واہمہ ہیں۔ انگلز (Engels) اس باب میں لکھتا ہے:

> تاریخ کے مادی تصور کی ابتداء اس اصول سے ہوتی ہے کہ پیداوار' اور پیداوار کے ساتھ اس کی تقسیم' ہی سوسائٹی کے ہر نظام کی بنیاد ہوتی ہے..... اس تصور کی رو سے' ہر تمدنی تغیر یا سیاسی انقلاب کی علت العلل۔ اس کے بنیادی اور اصلی سبب کو' لوگوں کے دلوں کے اندر' یا خارجی حق و صداقت اور عدل و انصاف کے متعلق ان کی بڑھتی ہوئی بصیرت میں تلاش نہیں کرنا چاہئے۔ اس کے لئے دیکھنا یہ چاہئے کہ ان لوگوں نے پیداوار اور اس کی تقسیم کے طریقوں میں کیا تبدیلیاں کی تھیں۔ بالفاظِ دیگر ان تصادمات اور انقلابات کے بنیادی سبب کو ان کے فلسفۂ زندگی (یا نظریۂ حیات) میں تلاش نہیں کرنا چاہئے۔ اس دور کی اقتصادیات میں تلاش کرنا چاہئے۔

(Anti Duhring, p-300)

جہاں تک آئیڈیالوجی (یا نظریۂ حیات) کا تعلق ہے' انگلز لکھتا ہے کہ:

> (اس میں شبہ نہیں کہ) آئیڈیالوجی کو نام نہاد مفکر' شعوری طور پر عمل میں لاتا ہے لیکن اس کا یہ شعور جھوٹا (False Consciousness) ہوتا ہے۔ اس کے عمل کے حقیقی محرکات اس کی نگاہوں سے

اوجھل رہتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتو اس کا عمل مبنی بر نظریہ کہلا ہی نہ سکے۔ لہٰذا وہ جھوٹے یا سطحی محرکات کو حقیقی محرکات تصور کر لیتا ہے۔

(Marx-Engels Correspondence, p.510-511)

یعنی جنہیں ہم حق و باطل کی لڑائیاں یا تصادمات کہتے ہیں' وہ درحقیقت حق اور باطل کی لڑائیاں نہیں تھیں' وہ درحقیقت معاشی لڑائیاں تھیں۔ حق کی خاطر لڑنے والے مصلحین حتیٰ کہ حضرات انبیاء کرام (معاذ اللہ) خود فریبی میں مبتلا تھے جو اسے حق و باطل کا تصادم سمجھ لیتے تھے۔ ان کا حقیقی جذبۂ محرکہ معاشی ہی ہوتا تھا جو شعوری طور پر ان کی نگاہوں سے اوجھل رہتا تھا۔

یہ ہے اشتراکیت کا سب سے اہم نظریۂ تاریخ لیکن جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے' قرآن کا نظریۂ تاریخ اس کے بالکل برعکس ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تاریخ مختلف نظریاتِ حیات کی کشمکش کا ریکارڈ ہے۔ جو نظریہ قوانین خداوندی کے مطابق ہوتا ہے' اسے کامیابی حاصل ہوتی ہے جو ان کے خلاف ہوتا ہے وہ شکست کھا جاتا ہے۔ تاریخ کا ریکارڈ قرآن کے اس دعویٰ کی صداقت کی شہادت پیش کرتا ہے۔ اس میں خود کوئی قوت نہیں ہوتی۔ قوت' قانون میں ہوتی ہے۔ قانون کی سرگزشت میں نہیں۔۔۔ اقوامِ سابقہ کی ان سرگزشتوں کو بھی قرآن نے داستان گوئی کے لئے بیان نہیں کیا۔ وہ اپنی مخاطب قوم سے (یعنی ہر زمانے کی اقوام سے) یہ کہتا ہے کہ ان اقوامِ سابقہ کے انجام و عواقب کو سامنے رکھ کر' تم اپنے لئے آپ فیصلہ کر لو۔ جس قوم جیسی روش تم اختیار کرو گے اسی قوم جیسا انجام تمہارا ہو جائے گا۔

قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قوم (حضرت) نوحؑ سے کیا ہے اور مختلف اقوام کی سرگزشتیں بیان کرتا' عہد نبی اکرم ﷺ تک پہنچ گیا ہے۔ میں آج کی نشست میں یہ واضح کروں گا کہ قرآن کریم نے وہ کون سے جرائم (یعنی غلط نظام) بتائے ہیں جن کی وجہ سے یہ قومیں تباہ و برباد ہوئیں اور مقصد اس سے یہ ہے کہ اس کے بعد ہم دیکھیں کہ کیا ہم بھی قومی حیثیت سے انہی جرائم کے مرتکب تو نہیں ہو رہے؟

تمہیدی وضاحت

اس سلسلہ میں دو اہم امور کا تذکرہ ضروری ہے۔ ایک تو یہ کہ غلط روش پر چلنے والی قوم میں مختلف قسم کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں لیکن قرآن کریم ان تمام خرابیوں کا ذکر نہیں کرتا۔ اس میں سے صرف اس بنیادی خرابی کا ذکر نمایاں طور پر کرتا ہے' جو اس نظام کی اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہے اور باقی خرابیاں جس کے برگ و بار ہوتی ہیں۔ خدا کا رسول بھی

سب سے زیادہ زوراسی بنیادی خرابی کے ازالہ پر دیتا اوراسی کوان کی تباہی کا موجب قرار دیتا ہے۔ان اقوام کی سرگزشت کے بعد جب ان بنیادی جرائم کی فہرست ہمارے سامنے آئے گی تو یہ حقیقت واضح طور پر منکشف ہوجائے گی کہ قومیں کس قسم کے جرائم یا غلط نظریاتِ زندگی کی وجہ سے تباہ ہوتی ہیں۔ واضح رہے کہ اصل چیز نظریۂ زندگی یا نظامِ حیات ہے۔ جرائم درحقیقت غلط نظریہ یا تخریبی نظام کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔

اوریہیں سے وہ دوسری بات ہمارے سامنے آجاتی ہے جس کا کا ذکر کرنا میں نے ضروری قرار دیا ہے اوروہ یہ کہ تباہ ہونے والی قوم میں یہ نہیں ہوتا کہ اس میں کوئی فرد بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں خوبیاں یا اچھائیاں ہوں۔اس میں اچھے افراد بھی ہوتے ہیں لیکن غلط اجتماعی نظام کے تباہ کن نتائج کوان کی انفرادی نیکیاں روک نہیں سکتیں۔ یہی وجہ ہے جوقرآن نے کہا ہے کہ: وَاتَّقُوْا فِتْنَةً لَّا تُصِيْبَنَّ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْكُمْ خَآصَّةً (8:25)-اس فتنے سے بچتے رہو جو جب آتا ہے تو صرف انہی لوگوں کو اپنی لپیٹ میں نہیں لیا کرتا جنہوں نے ظلم وجرائم کئے ہوں۔ وہ سب کو بہا کر لے جایا کرتا ہے۔ جب دریا کے بند کو احتیاط سے نہ باندھنے کی وجہ سے سیلاب آجاتا ہے تو وہ صرف انہی کے گھروں کو تباہ نہیں کرتا جو اس تغافل یا تساہل کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ وہ بستیوں کی بستیوں کو تباہ کر کے رکھ دیا کرتا ہے۔لہٰذا' دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ کوئی قوم اپنے ہاں نظام کس قسم کا رائج کرتی ہے۔غلط نظام میں بسنے والے وہ افراد بھی تباہی سے نہیں بچ سکتے جنہوں نے انفرادی طور پر کوئی جرم نہ کیا ہو۔اس سے وہی لوگ بچ سکتے ہیں جو اس نظام کو مسترد کر کے یا تو اس کی جگہ صحیح نظام قائم کریں یا ان لوگوں سے الگ ہوکر' کسی ایسی جگہ چلے جائیں جو صحیح نظام کے قیام کے لئے سازگار ہو۔اسے دین کی اصطلاح میں ہجرت کہا جاتا ہے جو قریب قریب ہر رسول کا شیوہ رہا ہے۔

اس تمہید کے بعد' ہم ان اہم اقوام کی سرگزشتوں کی طرف آتے ہیں جنہیں قرآن کریم نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے۔

☆☆☆

قوم (حضرت) نوحؑ

قرآنِ کریم نے اقوام سابقہ کی سرگزشتوں کے سلسلہ کا آغاز' قوم نوح سے کیا ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ قرآن کریم تاریخ کی کتاب نہیں۔۔۔اس لئے وہ ان اقوام کے زمان ومکان کے متعلق گفتگو نہیں کرتا۔ وہ اپنے آپ کو مقصدِ پیشِ نظر تک محدود رکھتا ہے یعنی اس حقیقت تک کہ اس قوم نے اپنے ہاں معاشرہ کس قسم کا قائم کر رکھا تھا۔اس معاشرہ کی نمایاں

خرابیاں کیا تھیں۔ اور اس کا انجام کیا ہوا۔

پھر یہ بھی واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ میں صرف انہی اقوام کا ذکر کیا ہے جن کے احوال و کوائف سے اس کی اولین مخاطب (عرب) قوم اچھی طرح واقف تھی اور اسے کرنا بھی یہی چاہئے تھا۔ مثلاً اگر وہ یہ کہتا کہ دیکھو! پارتھین قوم نے یہ کیا اور اس کا انجام یہ ہوا' تو قوم مخاطب سب سے پہلے یہ سوال لے اٹھتی کہ پارتھین قوم کون تھی' کہاں تھی' ان کی تباہی کیسے ہوئی اور کیا معلوم یہ کچھ ہوا بھی یا نہیں۔ یہ سلسلۂ بحث و تمحیص شروع ہو جاتا اور اصل مقصد اسی الجھاؤ میں کھو جاتا۔ وہ جن اقوام کا ذکر کرتا ہے ان کی داستانیں' قوم مخاطب (عربوں) کے ہاں عام تھیں اور ان کی اُجڑی ہوئی بستیوں کے کھنڈرات' ان کے گرد و پیش اور ان کی مسافرت کے راستوں میں بکھرے پڑے تھے یعنی وہ اقوام جن کے متعلق وہ کہتا ہے کہ یَمْشُوْنَ فِیْ مَسٰکِنِھِمْ (20:128) - جن کی بستیوں میں یہ لوگ چلتے پھرتے ہیں۔ ان اقوام کی سرگزشتوں سے وہ اچھی طرح واقف تھے۔ قرآن نے فقط اتنا بتایا..... کہ ان کا یہ انجام کیوں ہوا اور اگر تم بھی وہی کچھ کرو گے تو تمہارا انجام بھی ویسا ہی ہوگا۔

آغاز داستانِ قومِ نوحؑ

ہاں تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ قرآنِ کریم نے اس سلسلہ کا آغاز قوم نوح کی سرگزشت سے کیا ہے۔ تاریخی قیاسات کا رُخ اس طرف ہے کہ یہ قوم دجلہ اور فرات کی وادیوں میں بستی تھی اور ان کا زمانہ کوئی چار پانچ ہزار قبل مسیح کا تھا۔ قرآنِ کریم نے بتایا ہے کہ وہ قوم' زمانہ قبل از تاریخ کی دیگر اقوام اور قبائل کی طرح' بت پرست تھی۔ ہنوز تمدن کی اس سطح پر بھی نہیں پہنچی تھی جہاں اتنا بھی معلوم ہو کہ سیلاب کی تباہی سے بچنے کے لئے کشتی بنائی جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت نوحؑ کو کشتی بنانے کی ترکیب بھی بذریعہ وحی بتائی تھی اور جب وہ لوگ انہیں کشتی بناتے دیکھتے تو ان کا مذاق اڑاتے تھے۔ جو رسوم و رواج اور زندگی کے طور طریق انہیں آباؤ اجداد سے وراثت میں ملے تھے' انہیں بے حد مقدس سمجھتے اور ان پر شدت سے کاربند رہتے تھے۔ وہ ان کے خلاف ایک لفظ تک سننا گوارا نہیں کرتے تھے' خواہ وہ کتنا ہی دلائل و برہان پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اس قوم کی علمی' ذہنی' اور تمدنی سطح تو یہ تھی۔

طبقاتی امتیازات

لیکن معاشرہ میں طبقاتی امتیازات بڑی اہمیت اختیار کر چکے تھے اور یہی اس معاشرہ کی سب سے بڑی خرابی تھی

جسے قرآن نے نمایاں طور پر بیان کیا ہے اور جس کے نتیجہ میں وہ قوم تباہ ہوگئی۔ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70) - تمام انسان بنیادی طور پر یکساں واجب التکریم ہیں۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی بچوں میں کسی قسم کی تفریق نہیں کی جاسکتی۔ معاشرہ میں مدارج کا تعین جو ہر ذاتی اور حسنِ سیرت و کردار کی رُو سے ہوگا' نہ کہ حسب نسب' پیشہ' یا دولت کے معیار کے مطابق۔ یہ تھی وہ بنیادی قدر جسے حضرت نوحؑ نے پیش کیا اور جس کی مخالفت اور سخت مخالفت' اکابرین قوم کی طرف سے ہوئی۔

مخالفتِ ملاءِ قوم کی طرف سے

اس مقام پر ایک اور بنیادی نکتہ کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔ قرآن کریم نے ہر رسول کے سلسلہ میں کہا ہے' کہ اس کے انقلابی پیغام کی مخالفت' سب سے پہلے' ملاءِ قوم نے کی۔ اس میں قال الملاء الذین کفرو کے الفاظ اس تکرار و اصرار سے آتے ہیں کہ ایک پارہ (نویں پارہ) کا عنوان ہی قال الملاء ہے۔ اس کا عام ترجمہ کیا جاتا ہے ''سردارانِ قوم''۔ عُرفی اعتبار سے یہ ترجمہ صحیح ہے لیکن مادہ کے لحاظ سے اس کے معنی ہیں وہ لوگ جن کے برتن ضروریات زندگی کے سامان سے ہر وقت بھرے رہیں یعنی قوم کا دولت مند' خوشحال طبقہ۔ انہی کو قرآن نے دیگر مقامات پر مترفین کہہ کر پکارا ہے یعنی وہ لوگ جو دوسروں کی کمائی پر عیش و آرام کی زندگی بسر کریں جنہیں زندگی کی آسائشیں بافراط حاصل ہوں۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ جب اور جہاں بھی آسمانی انقلاب کی آواز بلند ہوئی' قوم کے دولت مند' سرمایہ پرست طبقہ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر اس کی مخالفت کی اور ان کی تائید و حمایت مذہبی پیشوائیت کی طرف سے ہوئی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے جب اپنی قوم سے کہا کہ جو غلط نظریات اور مسالک تمہارے معاشرہ میں عام ہو رہے ہیں ان کی جگہ قوانین خداوندی کی اطاعت اختیار کرو' تو فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ (11:27)- تو اس قوم کے اکابرین نے' جن کے ہاں دولت کی افراط تھی اور اس وجہ سے انہوں نے صحیح مسلک زندگی سے انکار اور سرکشی کی راہ اختیار کر رکھی تھی' اس سے کہا کہ مَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِيَ الرَّاْيِ (11:27) - تم ہمیں کس بات کی دعوت دیتے ہو؟ ہم دیکھ یہ رہے ہیں کہ ہمارے معاشرہ کے نہایت پست درجہ کے' کمینے اور ذلیل لوگ تمہارے پیچھے لگ گئے ہیں۔ نہ انہیں عقل ہے نہ فکر۔ اس لئے وہ بلا سوچے سمجھے تمہارے ساتھ ہو لئے ہیں اور تم اس فریب میں مبتلا ہو گئے ہو کہ تمہاری دعوت حق و صداقت پر مبنی' اور تمہاری پکار بڑی جاذب ہے۔ تم کہیں پاگل تو نہیں ہو گئے (26:16)' وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ

فَضْلٍ (11:27)- ذرا بتاؤ تو سہی کہ تمہیں اور تمہارے ان ساتھیوں کو ہمارے مقابلہ میں کونسی فضیلت حاصل ہے جو ہم اس جماعت میں شامل ہو جائیں۔

اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے کہا کہ جو کچھ میں تم سے کہہ رہا ہوں' اسے سوچو اور سمجھو۔ اسے دیکھو اور پرکھو کہ وہ حق وصداقت پر مبنی ہے یا نہیں۔ یہ نہ دیکھو کہ جن لوگوں نے اسے قبول کیا ہے' ان کا پیشہ کیا ہے وَمَا عِلْمِیْ بِمَا کَانُوْا یَعْمَلُوْنَ (26:112)- میری نگاہ ان کی سیرت وکردار پر ہے۔ اس سے مجھے کچھ سروکار نہیں کہ وہ کام کاج کیا کرتے ہیں۔ جس معاشرہ کی تشکیل کی میں دعوت دیتا ہوں اس میں معیار تکریم وتعظیم' کردار کی بلندی اور جوہر ذاتی کی گراں مائیگی ہوتا ہے' نہ کہ حسب ونسب کی تفریق اور ذاتوں اور پیشوں کی تمیز۔ حسب ونسب کی تفریق انسانی انانیت کا خودساختہ امتیاز ہے۔ اور پیشوں کا فرق' معاشرہ میں تقسیم کار کا فطری نتیجہ۔ لہٰذا' ان امور کو شرف انسانیت سے کیا واسطہ؟ اگر ایک محنت کش' مزدور' کیریکٹر کے اعتبار سے بلند ہے تو وہ اس صاحبِ ثروت سے ہزار درجہ بہتر ہے جس کا کردار پست ہے۔

اس پر ان اکابرین قوم نے کہا: یٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَکْثَرْتَ جِدَالَنَا (11:32)- اے نوح! ہم نے دیکھ لیا کہ تم بہت جھگڑالو واقعہ ہوئے ہو۔ تم نے بہت لمبی چوڑی باتیں کرلیں اور ہم نے سن لیں۔ اس بحث وتمحیص سے کچھ حاصل نہیں۔ ایک فیصلہ کن بات سن لو۔ وہ یہ کہ ان ذلیل اور کمینے لوگوں کو اپنی جماعت سے نکال دو۔ اس کے بعد ہم تمہارے ساتھ ہو جائیں گے۔ ہم ان کے ساتھ بیٹھنے کے لئے تیار نہیں۔ یہ بھی بھلا کوئی بات ہوئی کہ قوم کے اشراف واجلاف' رؤسا وغرباء اور سرمایہ دار اور محنت کش' ایک ہی صف میں کھڑے ہو جائیں؟ اس کے جواب میں حضرت نوحؑ نے ان متکبرین سے کہا کہ تمہارا مطالبہ یکسر باطل اور بیہودہ ہے۔ دعوتِ خداوندی کی رُو سے انسانوں کی وجہ جامعیت واخوت ایمان ہے وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الْمُؤْمِنِیْنَ (26:114)- میں تمہاری خاطر' ان لوگوں کو جو اس کی دعوت کی صداقت پر ایمان لا چکے ہیں' دھتکار نہیں سکتا۔ وَیٰقَوْمِ مَنْ یَّنْصُرُنِیْ مِنَ اللّٰہِ اِنْ طَرَدْتُّھُمْ (11:30)- اگر میں انہیں دھتکار دوں' تو تم تو بے شک خوش ہو جاؤ گے' لیکن یہ بتاؤ کہ اس جرمِ عظیم کی پاداش سے' جو خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی رُو سے مجھے ملے گی' مجھے کون بچا سکے گا؟ اگر میں نے ایسا کیا تو اِنِّیْٓ اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِیْنَ (11:31)- تو میں بھی انہی لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو غریبوں اور مفلسوں کو نفرت وحقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ تو بڑا ظلم ہوگا۔ میں اس کا مرتکب نہیں ہوسکتا۔

اس پر انہوں نے کہا کہ اے نوحؑ! تم اگر اس کے لئے آمادہ نہیں ہوتو اسے اچھی طرح سن رکھو کہ ہم تمہاری ان حرکتوں

کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتے۔ تم ان ادنیٰ اور رذیل لوگوں کو سر پر چڑھا کر' طبقاتی امتیازات کو مٹانے کا خیال عام کر رہے ہو۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے معاشرہ میں فساد برپا ہو جائے گا۔ ہم اس کی اجازت نہیں دے سکتے۔ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (26:116)- اگر تم اس فتنہ پردازی سے باز نہ آئے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیں گے۔

چنانچہ انہوں نے حضرت نوحؑ اور ان کی جماعت کے خلاف پراپیگنڈہ کا ایک منصوبہ تیار کیا جس میں مذہبی پیشوائیت ان کا مؤثر ترین آلۂ کار تھی۔ وجۂ مخالفت تو وہ تھی جس کا اوپر ذکر آ چکا ہے لیکن مذہبی پیشوائیت ہر فتنہ کو مذہب کا رنگ دے کر عوام کے جذبات کو مشتعل کرتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ڈگڈگی بجانی شروع کر دی کہ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَصُدُّوْنَا عَمَّا كَانَ يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا (14:10)- لوگو! دیکھو یہ نیا فتنہ اٹھا ہے۔ یہ تمہیں تمہارے اسلاف کے مذہب سے منحرف کرانا چاہتا ہے۔ یہ ان معبودوں کی مخالفت کرتا ہے جنہیں تمہارے آباء واجداد پوجتے چلے آئے ہیں! امیر اور غریب کا فرق خدا کا پیدا کردہ ہے۔ معزز اور ذلیل کی تفریق پیدائشی ہے۔ یہ ان امتیازات کو مٹا کر مساوات کی غیر فطری دعوت دیتا ہے۔ یہ کفر ہے' یہ الحاد ہے۔ یہ بالکل انوکھی بات ہے۔ مَّا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِيْٓ اٰبَآئِنَا الْاَوَّلِيْنَ (23:24)- ہم نے اس قسم کی باتیں اپنے آباء واجداد سے کبھی نہیں سنیں۔ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ تم اٹھو اور اس فتنہ کا سر کچل کر رکھ دو۔

یہ تھا وہ مقام جہاں حضرت نوحؑ نے (قرآن کے الفاظ میں) اپنے رب کو پکارا اور کہا تھا کہ اس قوم کے سعادت مند افراد نے حق وصداقت کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ اس کے باقی ماندہ افراد میں اصلاح کا کوئی امکان نہیں۔ لہٰذا انہیں تباہ ہو جانا چاہئے۔ اس کے لئے انہوں نے دلیل بڑی دقیع دی تھی۔ انہوں نے کہا تھا کہ اگر معاشرہ کی یہ خرابی انہی موجودہ افراد تک محدود ہوتی تو اسے برداشت کر لیا جاتا لیکن مشکل یہ ہے کہ جو نسل ان سے آگے چلے گی وہ بھی انہی نظریات کی حامل اور اسی انداز معاشرت کی علمبردار ہو گی۔ اس طرح یہ وجۂ تفریق انسانیت کا انداز معاشرہ نسلاً بعد نسلٍ آگے بڑھتا چلا جائے گا اور یہ روش عالمگیر ہو جائے گی۔ اس لئے رَّبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا (71:26)- بارالہا! ان لوگوں کا نام ونشان تک مٹا دے۔ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا (71:27)- اگر ان لوگوں کو علیٰ حالہٖ چھوڑ دیا گیا تو یہ دوسرے لوگوں کو بھی گمراہ کریں گے اور ان کی آنے والی نسل بھی' جو انہی کی گود میں پروان چڑھے گی۔ انہی نظریات کی حامل ہو گی۔

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

Media proposal

Allama Parwez has written in his *Nizam-i-Rabbubiyat* that in order to promote the Truth to the masses we must *harness the power of the media*.

The Tolu-e-Islam organisation has been printing its magazine as well as producing a range of literature for almost 75 years. Now we feel it is high time we bring the organisation into the 21st century and utilise modern media. We aim to broaden our range of material to make it relevant to *Muslim youth in the West*, and to make it available in the *English language*.

We have a number of dedicated and experienced media individuals who are willing to help make this happen, and who have the capability to produce regular programming for television and DVD. There will be *opportunities for readers' businesses to advertise on and sponsor our programmes*, and we are also open to any suggestions and ideas our readers may have on what they'd like to see.

We have a moral obligation to educate and promote Truth. Modern media (TV and film) is the most effective means of reaching people in today's world. This is only possible with the cooperation of like-minded individuals who are willing to act and invest in what they believe in.

Any readers and businesses who wish to contribute to this worthwhile project should contact **Maqbool Farhat** of Ilford, UK at
islamicdawnmedia@gmail.com